فہرست مضامین

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

محرم الحرام ۱۴۰۲ھ تا ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ **جلد ہفت دہم** اکتوبر ۱۹۸۱ء تا ستمبر ۱۹۸۲ء

سترویں جلد کے مضامین کی یہ فہرست موضوعات کے لحاظ سے اُن سلسلہ وار صفحات کے حوالہ سے دی
ہے جو ہر صفحہ کے نیچے لکھے ہوئے ہیں یہ فہرست جلد کے آغاز میں لگوا لیجئے۔ (سمیع الحق)

نقش آغاز (اداریہ) سمیع الحق

مذہب — حقانیت و صداقتِ اسلام — عقائد احکام

دعوات عبدیتِ حق ۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ

قرآنیات

سنت و سیرت مطہرہ

نظامِ حکومت ، فقہ اسلامی ، آئین و قانون

وفاقی مجلس شوریٰ میں نظامِ اسلام کیلئے مساعی — سمیع الحق

شخصیات — سوانح

فرق باطلہ — قادیانیت وغیرہ

عروج و زوال — جہاد

عالمِ اسلام، تاریخ و سیر و سیاحت

مذہب اور سائنس

ادبیات — لسانیات

تعلیم و تربیت، تعلیمی ادارے، نصاب و نظامِ تعلیم

متفرقات — افکار و اخبار

خطوط مشاہیر و اکابر

دارالعلوم کے شب و روز

کتابیات — تعارف و تبصرۂ کتب

اے۔بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

فون نمبر دارالعلوم ۔ ۴ | لۂ دعوۃ الحق | فون نمبر رہائش ۔ ۲

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد نمبر ۱۷ | ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ

شمارہ نمبر ۱۲ | ستمبر ۱۹۸۲ء

ماہنامہ **الحق** اکوڑہ خٹک

مدیر : سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

- پاکستان میں سالانہ ۲۵/- روپے فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
- بیرون ملک بحری ڈاک ۳ پونڈ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کراچی

سرسیّد احمد خان

افکار اور سیرت کا ایک بے لاگ جائزہ

سرسیّد کی زندگی اوران کے افکار و سیرت پر جب بھی نظر ڈالی جائے گی تو وہ دو بڑے ادوار میں بٹی ہوئی نظر آئے گی۔ پہلا دور ۱۸۵۷ء پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ سرسید کی تعلیم (اور وہ متوسط کتابوں سے آگے نہیں بڑھی تھی) اور تربیت پرانے انداز پر ہوئی تھی۔ اس میں قدیم نظام تعلیم و تربیت کی جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، انحطاط پذیر معاشرے اور بگڑے ہوئے جاگیر دارانہ ماحول کی خامیاں بھی تھیں۔ حصول تعلیم کی خاص عمر میں تعلیم سے بے توجہی اور عدم تکمیل، آوارگی۔ میلوں ٹھیلوں میں شرکت کا شوق، راگ رنگ کی مجلسوں کا چسکا۔ رنڈی بازی وغیرہ کی لت اسی انحطاط پذیر معاشرہ اور بگڑے ہوتے جاگیر دارانہ ماحول کے اثرات تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قدیم معاشرے کی جو خوبیاں اس وقت موجود تھیں اور بعد میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئیں ان میں سے بعض سرسید میں موجود تھیں۔

سرسیّد کی زندگی کا پہلا دور روایتی انداز میں شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر سے، اپنے خاندان کے بزرگوں سے، اپنے استادوں سے، اپنے دوستوں سے، گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اوران کا ماحول جس قسم کی شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا اسی طرح ان کی تعمیر ہوئی۔ ان کے افکار و معتقدات اور شوق و مشاغل سب وہی تھے جو ان کی طرح دوسرے نوجوانوں کے تھے۔ لیکن ان کا اظہار سرسید کی اپنی شخصیت کے حوالے سے ان کے مخصوص انداز میں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی بالکل قلب ماہیت ہوگئی تھی۔ اس تبدیلی کی بنیاد ان کی سرکاری ملازمت کے آغاز سے پڑ چکی تھی۔ تکمیل ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی۔ اب وہ اپنے انداز فکر اور افکار و عقائد کے لحاظ سے بالکل مختلف شخصیت تھے۔ ایک قالب میں روح کے تسلسل نے انہیں ایک شخصیت کہنے پر مجبور کردیا ہے ورنہ وہ اپنے پورے نظام فکر کے لحاظ سے ایک دوسری شخصیت کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ اس تالیف کے آئینے میں یہ دونوں مختلف اور متضاد شخصیتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جدید تعلیم کی اشاعت، زبان و ادب کی ترقی، صحافت کے ذوق کی تعمیر، تحقیق و تدوین اور تالیف و تراجم

کی تحریک میں سرسید کی خدمات کا انکار ممکن نہیں - بلکہ ہم ان کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرنے پر مجبور ہیں - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں دینی بے راہروی کی اگر علمی بنیادیں تلاش کریں تو وہ سرسید کی تفسیر، تہذیب الاخلاق کے مقالات، مذہبی مسائل و معتقدات کے بارے میں ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کرنی چاہئیں - سرسید نے بعض مذہبی معتقدات کے لئے صرف تاویل ہی کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ انکار و تمسخر کی روش کو اپنایا ہے - انہوں نے اسلامی معتقدات کی سربفلک عمارت کو ڈھایا ہی نہیں بلکہ اس کی تباہی پر قہقہے بھی لگائے اور اس کی شان و رفعت کا مذاق بھی اڑایا - میں یہاں ان کی تفسیر سے صرف ایک اقتباس پیش کروں گا - جنت کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے اس میں سنگ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں - باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے - ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے - ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے - ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ - ایسا بے ہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے - اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں"

اس عبارت کو ایک بار نہیں بار بار پڑھئے اور غور کیجئے، کیا یہ ایک اسلامی اور مبنی برنص قرآنی عقیدے کی حکیمانہ تفسیر اور محض تاویل ہے یا انکار و تمسخر - کیا اسے پڑھنے کے بعد سرسید کا کوئی معتقد اسلامی عقائد پر قائم واستوار رہ سکتا تھا اور رہا؟ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید سا عقل پرست، اور وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم کلام کے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی، فہم و بصیرت اور حکمت سے دور ایسی باتیں کرتا ہے - جنت کا خود ہی ایک نقشہ کھینچتا ہے پھر اس پر بے ہودہ پن کی پھبتی کستا ہے اور پھر اپنے خرابات سے اس کا موازنہ کر کے انہیں جنت سے ہزار درجہ اچھا بتاتا ہے - یا للعجب!

یہ ہے اس دور کی بے دینی اور بد عقیدگی کا سرچشمہ جس کی تلاش میں ہمارے اہل علم اور اصحاب فکر زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور سررشتہ فکر پھر بھی ہاتھ نہیں آتا - یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ اس صدی کی بے دینی، مذہبی بے راہ روی اور بد عقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسید سے ملتے ہیں - دور جانے کی ضرورت نہیں - پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی شعائر کے احیاء میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ حضرات ہیں جو سرسید کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرسید کے دو دشمن تھے - ایک انگریز کے مخالف اور برصغیر کی آزادی کے خواہاں - دوسرے علماء دین

اور تاریخ مسلمانان ہند کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ علمائے دین ہی انگریزوں کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث ہیں ادب کے سنجیدہ مضامین ہیں تمثیلوں اور تجزیوں میں انہوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔ کوئی شخص انگریز سے دشمنی کر کے سرسید کا دوست نہیں بن سکتا تھا۔ گویا یہ دو تلواریں تھیں جو سرسید کے میان قلب میں جگہ نہ پا سکیں۔ اسی طرح مذہبی حیثیت میں انگریز کے ان دشمنوں کی مخالفت اور طنز و تعریض ان کا دین بن گیا تھا۔ دینی معتقدات پر ایمان رکھنے اور انہیں بیان کرنے والے ان کے نزدیک "کوڑ مغز ملّا" اور "قُل اعوذیے" تھے اور زہد و ورع کی زندگی اختیار کرنے والے کے لئے انہوں نے "شہوت پرست زاہد" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ملّا، صوفی، زاہد، قاضی، ناصح، اور واعظ کے متعلق شاعری میں طنز و تضحیک کے مضامین ملتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اردو یا فارسی کا سب سے پہلے شاعر کون اور کس عقیدے سے تعلق رکھتا تھا جس نے اسلامیات کی ان اصطلاحات اور دینی علم و سیرت رکھنے والی شخصیات کے خلاف یہ ادبی سازش کی اور اسلام سے تنفر کی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو ادب میں اس تحریک کے آغاز کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے۔ یہ محض قیاس یا سوء ظن نہیں بلکہ ایک عزیز کی تحقیق کے مطابق دینی فکر کے حامل افراد کے لئے "قُل اعوذیوں" کی اصطلاح سب سے پہلے سرسید نے استعمال کی۔ انہوں نے اسلامی معتقدات کی ایسی تاویل کی کہ پورا نظام عقائد درہم برہم ہو گیا۔ ان کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ پھر انہیں ماننے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔ اور مخالفین اسلام کے حملوں کے دفاع کے لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہا۔ دینی علم و سیرت رکھنے والوں کے خلاف انہوں نے طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کے اتنے تیر برسائے اور ان کے پاکیزہ چہروں کو ایسا مسخ کر کے پیش کیا کہ لوگوں کے قلوب ان کی عقیدت و محبت کے جذبات سے خالی ہو گئے۔

کسی عقیدے یا فکر سے وابستگی اور قلوب میں اس کے رسوخ کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ عقیدے اور فکر کا حسن کسی کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس طریقے سے ظاہر ہے کہ اہل علم ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس عقیدے اور فکر کے حاملین کی پاکیزہ سیرتیں اور نورانی چہرے دیکھ کر قبول حق کے لئے لوگوں کے قلوب کھل جائیں۔ سرسید نے ایک طرف تو علمائے دین کے تذکرے کے لئے جو اسلوب اختیار کیا اس نے اس ذریعے سے اسلام سے متاثر ہونے میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اور اسلامی معتقدات کے لئے جو طرز استدلال اختیار کیا اس سے قبول حق کے لئے قلب کھلنے کے بجائے اعراض و انکار کا دروازہ کھل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اسلام اور اسلامی معتقدات سے برگشتہ ہوئے اور غیر مسلمان قبول اسلام کے عمل سے رک گئے۔ یوں بھی دیکھئے کہ زندگی بھر تو کوئی شخص سرسید

کی مذہبی صورت سے متاثر ہوا، نہ ان کی شرح و تفسیر انجیل پڑھ کر کسی عیسائی نے اپنے عقیدے سے توبہ کی۔ نہ ان کے مذہبی مقالات اور تفسیر قرآن پڑھ کر کوئی غیر مسلمان مسلمان ہوا۔ نہ مسلمان پکا مسلمان بنا۔ ان کے مکتب کی سب سے بڑی کرامت یہ رہی ہے کہ اس نے "قانونی مسلمان" (بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی) اور ایثار و قربانی کی راہوں سے دور شور و ہنگامہ کرنے والے تعلیم یافتہ پیدا کئے۔ آج پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قومی زبان کے نفاذ کی تحریک میں اہل علم اور نوکر شاہی کا جو طبقہ کسی نہ کسی سطح پر مخالفت کر رہا ہے وہ سرسید کا معتقد ہے۔ یا ان سے کسی نہ کسی قسم کا ذہنی و فکری رشتہ ضرور رکھتا ہے۔

ایک اہم مسئلہ سرسید کی تفسیر کی اشاعت کا ہے سرسید نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔ لیکن تفسیر تو سرسید نے خود شائع کی اور اردو میں شائع کی۔ سوال یہ ہے کہ اردو دان طبقہ کا تعلق عام لوگوں سے تھا یا خواص سے؟ یہ کوئی نزاعی مسئلہ نہیں کہ اردو دان آج بھی "عام لوگ" سمجھے جاتے ہیں اور "خواص" وہ سمجھے جاتے ہیں جو صرف اردو دان نہ ہوں۔ بلکہ عربی، فارسی سے بھی واقف ہوں یا پھر انگریزی زبان و ادب یا دنیا کی کوئی اور بڑی اور علمی زبان اور اس کے ادب سے واقف ہوں۔ پس اگر تفسیر خواص کے لئے لکھی جاتی تو عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ زبانوں میں سے کسی زبان میں ہوتی۔ لیکن یہ روایت بھی تو حالی کی ہے کہ:۔ "ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد" سے سرسید نے سوال و جواب کے بعد کہا: میری تفسیر آپ کے لئے نہیں ہے، وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مذکورہ بالا عقائد (حشر و نشر، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، فرشتہ و شیطان اور قیامت وغیرہ) پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض یا ان پہ متردد ہیں۔

اس مقام سے یوں ہی نہ گزر جائیے، غور فرمائیے کہ ان کی تفسیر خود ان کے بقول "نہایت معقول اور ذی استعداد" اشخاص کے لئے نہیں تھی اور ان ہی کے بیان کے مطابق "عام لوگوں میں بھی اس کا شائع ہونا اچھا نہیں تھا" عام لوگوں میں تو اس کی اشاعت کی عدم مناسبت اور عدم ضرورت کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان میں اسلامی معتقدات کے بارے میں نہ اس وقت شک و شبہ پایا جاتا تھا نہ آج۔ نہ وہ ان پہ کبھی معترض ہوئے، نہ انہیں ان کے ماننے میں کبھی تردد ہوا۔ ان کے ذہن منطق و فلسفہ کی باریکیوں کو قبول ہی نہیں کرتے۔

اب سرسید کی تفسیر کے مطالعہ کے دوسرے حاجت مندوں کی ضرورت پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ انگریزی زبان کا علم اس وقت تک عام نہ ہوا تھا، اس کا زہر کہاں پھیلتا اور اس تریاق کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ جدید فلسفہ اور ان کی موشگافیوں اور قدیم حکماء، معتزلہ کی تاویلیت سے عوام تو عوام، خواص بھی ناواقف تھے جہاں جدید و قدیم علوم کی تعلیم ایک دو فی صد سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں سے فلسفہ و حکمت کا ذوق رکھنے والے کتنے نکلیں گے؟

الحاد و تشکیک کا جو سیلاب بیسویں صدی کے آغاز میں آیا، اس وقت اس کا پتہ نہ تھا، اس لئے انگریزی
دانوں، فلسفہ گزیدوں، معتزلہ کی تاویلات کے بخیروں اور الحاد و تشکیک کے ماروں کے لئے بھی ان کی تفسیر کی
اشاعت نہیں ہوسکتی تھی جن کا وجود ہی محض ایک مفروضہ اور عنقا کی مثال تھی۔ بالفرض کوئی ایسا طبقہ موجود
تھا جو کسی نئے علم کلام کا محتاج تھا تو پھر دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے مذکورہ بالا عقائد کے اثبات میں کون سے
پیش کئے ہیں؟ انہوں نے خود حشر و نشر، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، فرشتہ و شیطان وغیرہ کے بیان
جو مضحک، تمسخرانہ اور طنزیہ اسلوب اختیار کیا ہے اس کا رشتہ اثبات کے بجائے اعراض و انکار سے جا ملتا
سرسید کے افکار کے مطالعے کے بعد اسلامی عقائد کی صحت میں شک اور یقین میں تذبذب تو پیدا ہو سکتا ہے
ان پر غیر متزلزل ایمان اور اعتقاد میں پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ جو تفسیر چھپی اس پر یہ کہاں لکھ
گیا تھا کہ مسلمانوں کے فلاں طبقے کے لئے اس کا مطالعہ ممنوع ہے اور اگر لکھ بھی دیا جاتا تو یہ بات مطالعے
لئے محرک تو بن سکتی تھی۔ رکاوٹ ہرگز ثابت نہ ہوتی۔ تفسیر اردو میں چھپی تھی۔ سرسید کے ذہن میں اس کا مخاطب
ہو۔ مطالعے میں سب سے زیادہ "عام لوگوں" کے آئی۔ لیکن کیا سرسید کے فکر کی پوری صداقت اور رائے کا
اخلاص تفسیر کی عدم اشاعت و ضرورت مطالعہ کے متعلق ان کے مذکورہ ملفوظات میں موجود ہے؟ اس بات
بھی غور فرما لیجیے کہ آیا سرسید واقعی عام لوگوں میں اپنی تفسیر کی اشاعت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے یا معقول و ذی
استعداد لوگوں میں اس کی ضرورت کے قائل نہ تھے؟

سرسید کا ایک بیان وہ ہے جو آپ زیر تالیف کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے اور ایک مطالعہ تفسیر
عام لوگوں" دعوت" یہ ہے جس کے لئے تحریک پیدا کرنے کا مشورہ انہوں نے اپنے ایک عقیدت مند طالب علم
یہ عقیدت مند فرسٹ ایر کا طالب علم نیاز علی تھا جو اپنے تئیں روایتاً مسلمان نہ کہتا تھا بلکہ اپنے علم و مطالعہ
بنیاد پر اسلام کو سچا اور برحق دین سمجھ کر پختہ یقین رکھتا تھا۔ سرسید نے اس کے نام خط میں یہ مشورہ دیا کہ
تفسیر خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے ہم ذوق لوگوں کو جمع کر کے انگریزوں کی طرح ایک کلب قائم کر
اور چندہ جمع کر کے تفسیر منگوا لے اور تمام ممبران باری باری اس کا مطالعہ کر لیں۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور
ش ۴ ۲۲ص ۲۲۔ اب سرسید ہی کی اس تحریر کے ہوتے ہوئے اس بات پر کیسے یقین کر لیا جائے کہ وہ عام مسلمانوں
میں تفسیر کی اشاعت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور معقول اور ذی استعداد لوگوں کے لئے اس کے مطالعہ کی
ضرورت کے قائل نہ تھے۔

سرسید کے عقائد صحیح تھے یا غلط؟ دیوبند، بریلی، اہل حدیث وغیرہ کسی مسلک کے عالم دین کی بات
مانیے۔ اگرچہ دین کے معاملے میں بات انہی کی ماننی چاہیے۔ ان کے سب سے بڑے مخالف امداد العلی اور علی بخش تھے

کی بات بھی نہ مانئے، ان کے معتقدین و مخلصین کے افکار پر نظر ڈال لیجئے، جنہیں نہ آج تک کسی نے قل اعوذی
ہے، نہ ان کے فکر و عمل پر ملائیت کی کبھی پھبتی کسی گئی۔ میرا اشارہ محسن الملک، حالی اور ڈپٹی نذیر احمد
طرف ہے۔ محسن الملک کو سرسید سے باہم اخلاص و عقیدت بہت سے مسائل میں اختلاف کرنا پڑا اور
ہاہی مسلمانوں میں "چھپا پادری" قرار دیا۔ حالی کو بھی سرسید سے تعلق و ارادت کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا
سرسید نے تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی
یں اور نذیر احمد نے تو ان کی متعدد خدمات کے اعتراف کے باوجود یہاں تک لکھ دیا کہ"

"جو معان سید احمد خان نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے اور میرے نزدیک
ردستی مڑھے اور چپکائے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کا ماننا مشکل۔ یہ
معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حاملِ وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون
، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا"

سرسید کی تفسیر کے بارے میں ان کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ

'سرسید کی تفسیر دیوانِ حافظ کی ان شرح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے
جو توڑ دل سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنا دیا ہے"

کہتے ہیں درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور عمل کی کسوٹی اس کے نتائج ہیں۔ سرسید نے ایک درخت
لگایا تھا تو اس میں پھل بھی ویسا ہی آیا جیسا کہ سنت الٰہی نے اس کے لئے مقدر کر دیا تھا، اور عمل کا انہوں نے
ہے بیج بویا تھا اس میں ضروری تھا کہ اس سے برگ و بار بھی وہی پیدا ہوں جن کی صلاحیت قدرت الٰہی نے اس کی
فطرت میں ودیعت کی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج ان حقائق اسلامی کے
یقین سے محروم، ان کی صداقت میں تشکیک و تذبذب کا شکار، قرآن کے بیان کردہ معنوں کی صحت میں متردد حتیٰ
معترض وہی لوگ ہیں جو سرسید کے افکار و سیرت سے متاثر ہیں اور جن لوگوں کے مفروضہ الحاد و تشکیک کے رفع
کے لئے تفسیر لکھی گئی تھی وہی ان کی تفسیر کو پڑھ کر قرآنی صداقتوں کے اعتقاد سے سب سے زیادہ محروم ہو گئے
حکیم وقت نے تو الحاد و تشکیک اور تذبذب و تفسق کے موجودہ طوفان کا منبع کانٹ، ہیگل اور مارکس کے فلسفوں
کے بجائے سرسید کے افکار کی اشاعت کو قرار دیا ہے۔

سرسید کی خدمات کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی میدان میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سرسید نے تعلیم کا جو مقصد
قرار دیا تھا، وہ پورا ہوا؟ اور اس مقصد کے تحت علی گڑھ کی سرزمین میں جو پودا لگایا تھا اس کے پھل کے ذائقے
سے وہ محظوظ و لطف اندوز ہوئے تھے؟ اس سوال کے جواب کی ذمہ داری سرسید نے دوسروں کے لئے نہیں

چھوڑی۔ یہ بات ان کے اپنے بیان اور تحریر سے باہر نہیں۔ کہ وہ اس کے نتائج سے مایوس اور اس کے پھل کی تلخی سے بدمزہ ہو گئے تھے۔ کہاں سر سید کا یہ مقصد کہ ایک ہاتھ میں سائنس اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اور کہاں ان کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں اسلامی عقائد پر عدم یقین، "تذبذب اور تشکیک کا سیلاب عظیم؟ شاید بعض حضرات مدرسہ علی گڑھ کی طویل تاریخ میں چند مثالیں دینداری کی پیش کر کے اس کے پھل کی تلخی اور نتائج سے مایوسی کی بدمزگی کو دور کرنا چاہیں۔ اول تو کوئی ہوشمند، صاحب مطالعہ اور دیندار ایسا کرے گا نہیں، بالفرض اگر کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو مستثنیات سے ہم کب انکار کرتے ہیں۔ سعید و صالح فطرت اور قلب سلیم گرد و پیش کے اثرات سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔ اور اگر انہیں اس ماحول میں کوئی روشن سیرت بھی نظر آجائے تو ماحول کے اثرات سے یقیناً محفوظ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات میں شروع ہی سے کوئی نہ کوئی عالم حق اور صاحب سیرت رہا ہے۔ اور مدرسہ سر سیدؒ کے کچھ نہ کچھ طلبہ اپنے خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم و تربیت، اپنی ازلی سعادت، قبول حق کی استعداد کی بنا پر ان علمائے حق اور اصحاب سیرت سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے دینداری، نیکی اور شرافت کی کوئی مثال مل جاتی ہے تو یہ سر سید کے مکتب کی کرامت نہ تھی بلکہ اس کا سبب ان اساتذہ کی تعلیم و تربیت و صحبت میں تلاش کرنا چاہیے جن کا جوہر علم مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر تھا اور جن کی سیرتیں سیرت نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے انوار سے منور تھیں۔

میں نے یہاں تعلیم کے نتائج سے صرف سر سید کی مایوسی کا ذکر کیا ہے۔ حالی کے اعتراف، شبلی کے استدلال، سلیمان ندوی کی تحقیق کو پیش نہیں کیا۔ ابو الکلام چونکہ خود اپنا ایک نظام فکر رکھتے تھے۔ اس لئے ان کا حوالہ تو کسی طرح دے ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمیں ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج سے مایوس اور ان کا شکوہ سنج نہیں ہونا چاہیے۔ کہ تعمیر یا میں سائنس اور قرآن کی تختہ بندی کے عزم کا انہوں نے صرف ذکر کیا تھا۔ کالج کے قیام کا "اصلی مقصد"، یہ نہیں تھا کہ نتائج کی جانچ کے لئے اسے کسوٹی بنایا جائے۔ کالج کے قیام سے سر سید کا مقصد لارڈ میکالے کے مقاصد تعلیم کی تکمیل تھا میکالے نے کہا تھا کہ تعلیم کا مقصد ذہن و فکر کے لحاظ سے انگریز تیار کرنا ہونا چاہیئے خواہ مذہب کی رو سے وہ ہندو یا مسلمان کہلائیں۔ سر سید فرماتے ہیں:-

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ تیار کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں"

سرسید اردو کے بڑے حامی اور بڑے ادیب تھے۔ زبان و ادب پر ان کے بہت احسانات ہیں۔ اردو کے عناصرِ خمسہ میں سرسید کا مقام سب سے اونچا ہے اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ ان کے احسانات و تذکرے اور ان کی بڑائی کے اعتراف سے خالی نہیں۔ آئندہ بھی جو تاریخیں لکھی جائیں گی ان میں سرسید اور ان کے رفقاء کے لئے شاندار باب ہوگا۔ اور ان کی خدمات اور ان کی ادبی عظمتوں کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔ اس کے بغیر کوئی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سرسید کی زندگی کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ انہوں نے ہندی کے مقابلے میں اردو کے تحفظ کی تحریک میں انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ لیکن وہ سرسید ہی تھے جنہوں نے اردو میں سائنسی تراجم کی تحریک کو خود ختم کر دیا تھا۔ اور اورینٹل کالج لاہور کے قیام کی شدید مخالفت کی تھی۔ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ سرسید نے اردو ہندی تنازع میں جن شدید جذبات کا مظاہرہ کیا تھا اور جو پر جوش مضامین تحریر کئے تھے کیا واقعی اردو کے عشق میں تھے؟ کیا وہ واقعی ان کے حقیقی و مخلصانہ جذبات تھے؟ کہیں یہ بھی انہوں نے کسی انگریز کے ایماء پر تو نہیں لکھے تھے یا فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے کئی دوسرے مضامین کی طرح یہ بھی کسی "مسٹر بیک" نے تو ان کے نام سے لکھ کر نہیں چھپوا دئے تھے؟

زمانہ سازی اور وقت شناسی سرسید کو ان کے نانا سے وراثت سے ملی تھی۔ ان کے نانا نے سلطنت مغلیہ کی بہی خواہ کے پردے میں انگریزوں کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ سرسید نے اپنے عہد میں ٹھیک ٹھیک وہی کردار مسلمانوں کی بہی خواہ کے نام پر ادا کیا۔ مغلیہ حکومت اپنے جس انجام کو پہنچی اس کے اسباب فلسفۂ عمرانیات کے علماء کے نزدیک اندرونی تھے۔ علمائے سیاسیات اور مورخین نے اس کے خارجی اسباب میں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کو بتایا ہے۔ لیکن آج تک کسی مسلمان کو تو کیا کسی غیر مسلمان کو بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہوئی کہ قومی اور مغلیہ حکومت کو ختم کرنے اور انگریزوں کے اقتدار کو قائم کرنے اور مستحکم کرنے میں وہ انگریزوں کا برابر کا حصہ دار ہے۔ سرسید اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اور کہا کہ وہ ہمیں ہیں جنہوں نے انگلش حکومت اپنی بھلائی کے واسطے قائم کی" انہوں نے قوم کی جانب سے بھی صفائی پیش کر دی کہ یہ محض غلط ہے۔ کہ مسلمان انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں" انہوں نے اس بات کی بھی تردید کر دی کہ انگلش مینشن نے دھوکے یا فریب سے یہ ملک فتح کیا" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انگریزوں نے یہاں کی حکومت بزور حاصل کی ہے نہ کہ مکر و فریب سے۔ وہ اس ملک میں دوست کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ بطور ایک دشمن کے" پھر انہوں نے اپنی اس نیک خواہش کا اظہار بھی کیا۔

"ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (دائمی و ابدی) ہونی چاہئے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے۔

کے مقام کا نام آغاز پور رکھا گیا۔[۲۲]

اس کے بعد بایزید کی یہ تحریک مذہب کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی بن گئی۔ جس نے صوبہ سرحد کے عوام کے جذبۂ حریت کو جہاد میں بدل دیا۔ جس کے بعد خوشحال خان خٹک جیسے ملی شاعر اور جذبۂ آزادی کے علمبردار پیدا ہوئے۔ جو تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں اور بایزید کی سیاسی تحریک ہی کا اثر تھا کہ عہد برطانیہ میں عجب خان کی بہادری نے انگریزوں کی نیندیں حرام کر دیں[۲۳] اور اس علاقے کے لوگوں کے جذبہ جس ایمانی اور حریت ہی کی بنا پر "سکھ راج میں سید احمد شہید نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور اس سرزمین کو اپنا مرکز بنایا اور وادی کاغان کے شہر بالاکوٹ میں اسلامی تحریک احیاء کے جدیدہ کا یہ تاجدار ہمیشہ کے لئے مدفون ہے[۲۴] اور اسی تحریک کے سیاسی اثر کی بنا پر اس خطہ کے لوگوں نے قیام پاکستان میں اپنا بھرپور کردار ادا کرکے قائد اعظم سے ان الفاظ میں خراج تحسین وصول کیا۔

" آپ کی وفاداری، امانت اور بہادری کی وجہ سے ہم شمال مغربی سرحدوں کی دفاع سے بے فکر ہیں۔ قیام پاکستان میں آپ کا کردار ہمیشہ کے لئے سنہری حروف سے لکھا جاچکا ہے مجھے آپ کی اسلام دوستی اور ملی اتحاد پر فخر ہے"[۲۵]

ان تمام حقائق کے بعد یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ دسویں صدی ہجری کی ان دونوں شخصیتوں (بایزید انصاری اور پیر بابا) نے اپنے اپنے انداز میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی اصلاح کی۔ پیر بابا نے انہیں خالص روحانی تعلیمات سے آشنا کیا اور بایزید کی تحریک روشنیہ نے ان کے لئے روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے کے قیام کی تگ ودو کی جو ان کے لئے اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے کی فضا مہیا کر سکے۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ انہیں سیاسی آزادی حاصل ہوتی اور سیاسی آزادی کے حصول کا یہی وہ جذبہ تھا جو دسویں صدی ہجری میں تحریک روشنیہ نے اس خطے کے لوگوں میں پیدا کیا جو آگے چل کر پاکستان کے حصول کا سبب بنا۔ اور اس طرح تحریک روشنیہ کی وہ کوشش جو آج سے تقریباً پانچ سو سال قبل شروع کی گئی تھیں پاکستان کی صورت میں کامیاب ہوئیں۔ جس کے تحریک روشنیہ کے بانی بایزید انصاری کو جتنا بھی خراج عقیدت پیش کیا جائے کم ہے۔

ماخذ

۱۔ عبداللہ سید (مدیر) اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور پنجاب یونیورسٹی پریس فروری ۱۹۵۵ء ص ۵ (۲) ایضاً

۳۔ پیر باباجن کا نام سید علی ترمذی تھا ۹۰۸ ہجری میں افغانستان میں پیدا ہوئے۔ حصول علم اور معرفت کی

ڈاکٹر عبدالرشید صاحب پی ایچ ڈی۔ جامعہ کراچی

تحریک روشنیہ اور قیام پاکستان
ایک تحقیقی مطالعہ

تحریک روشنیہ اور اس کے بانی کے بارہ میں مختلف رائے پائی جاتی ہے۔ یہ ایک متنازعہ شخصیت رہی۔ ادارہ الحق کا پیش نظر مقالے سے اتفاق ضروری نہیں بحث و تمحیص سے کئی گوشے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے ——— ادارہ

دسویں صدی ہجری کا زمانہ تحریک احیائے دین اور تحریک پاکستان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے یہی وہ دور ہے جس میں اگر ایک طرف مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر دین الٰہی کا فتنہ برپا کر کے مسلمانوں کو ایک بڑے امتحان سے دوچار کرتا ہے اور اس دور کے صوفیا اور علمائے حق اس کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ تو دوسری طرف سے دہلی سے سینکڑوں میل دور صوبہ سرحد کے صوفیائے کرام نے نہ صرف ان بدعقیدگیوں کا اپنی زبان سے مقابلہ کیا بلکہ تحریک روشنیہ کے مجاہدین نے تلوار کے ذریعے شاہی فوج کے چھکے چھڑا دیے اور اس علاقے کے جیالے مسلمانوں کی بہادری کو جذبہ جہاد میں بدل دیا اور یہ اسی تحریک کی کوشش تھی جو آگے چل کر قیام پاکستان کا سبب بنی۔ لیکن مرکز سے دوری، دشوار گذار علاقوں کے سبب اور پشتو زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر ان حضرات کی خدمات کو تاریخ میں وہ مقام نہ دیا گیا جس کے یہ حقدار تھے۔ بالخصوص اس دور کی دو اہم شخصیتوں بایزید انصاری (پیر روشن) اور سید علی ترمذی (پیر بابا) کی خدمات کو یا تو یکسر نظر انداز کر دیا گیا یا پھر ان کے خلفاء کے باہمی جھگڑوں کو بیچ میں لاکر اس تحریک کو پس پردہ ڈال دیا گیا۔

زیر نظر مضمون میں بایزید انصاری کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے اور ان کے مخالفین کے عائد کردہ الزامات کا جواب دیتے ہوئے اس تحریک کی اہمیت کو واضح کیا جا رہا ہے۔

تعارف | بایزید انصاری جنہیں پیر روشن بھی کہا جاتا ہے تحریک روشنائی کے بانی تھے۔ آپ کا سلسلہ

ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا ان کی خوشامد کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہے۔"

یہ بات ایسی تھی کہ مسلمان تو مسلمان، انگریز بھی چونک پڑے کہ سید صاحب کیا فرماتے ہیں۔ دل میں خوش ہوتے ہوں گے کہ ایسا مخلص اور وفادار وکیل انہیں اپنی قوم اور حکومت کا، انقطاعے حکومت میں کاہے کو ملے گا؟ یہ اسپیچ جب اخبار میں سر ایلفرڈ لفٹیننٹ گورنر کی نظر سے گزری اور اس کے بعد سر سید سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔

"تم نے یہ عجیب طرح کی اسپیچ دی تھی؟"

سر سید نے جواب دیا: "شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی۔"

جو لوگ سر سید کو بانیان آزادی میں شمار کرتے ہیں انہیں سر سید کے ان بیانات و ملفوظات پر غور کرنا چاہیئے اور اس پہلو پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے کہ حقیقی بانیان آزادی اور سر فروشان قوم اور رجال نثاران وطن سلطان ٹیپو، سراج الدولہ اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے؟ اور اس کے برعکس غداران وطن جعفر و صادق وغیرہ کی سیرت اور عقل و فراست اور ان کی ملی بہی خواہی کو انہوں نے جو خراج تحسین پیش کیا ہے کس سے چھپا ہوا ہے؟ جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے مجاہدین کو وہ کون سی گالی ہے جسے سن کر دلی کے شرفا نگاہیں نیچی نہ کرلیں۔ اور سر سید نے تحریر کردی ہو ــــ انگریزوں کو استحکام بخشنے کے لئے انہوں نے تحریر و تقریر کی کس صلاحیت کو نہیں آزمایا؟ "لائل محمڈنز" ان کے نزدیک ملک و قوم کی علمی، تعلیمی، سماجی خدمات انجام دینے والے تھے یا ۱۸۵۷ء میں اور بعد میں ملک و قوم کے جذبات کے خلاف انگریزوں کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے والے ملک و قوم کے غدار تھے؟ ۱۸۹۸ء میں اپنی وفات تک علی گڑھ کالج کے طلبہ میں حریت پسندی کے جذبہ کو دبا دینے کی کوشش میں انہوں نے کون سی کسر اٹھا رکھی تھی؟ دنیا کے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی اور منصب خلافت سے عقیدت اور رشتہ اخوت اسلامی کا احترام اور اس کے لئے ایثار مسلمانان ہند کی ہمیشہ سے ایک خصوصیت رہی ہے۔ سر سید نے اس تعلق کے ایک ایک رشتے کو منقطع کرتے اور صرف ہندوستان کی برٹش حکومت سے مسلمانوں کو اپنے رشتہ عبودیت استوار کرنے کے لئے عقل و منطق کے کس حربے کو نہیں آزمایا؟ ان عظیم الشان خدمات اور بلند خیالات کے بعد بھی سر سید کو بانیان آزادی میں شمار اور آزادی کی تاریخ میں سب سے اونچا مقام دیا جا سکتا ہے؟

جو حضرات سر سید کو نظریہ پاکستان کے بانیوں اور مجاہدین آزادی میں شمار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کے متعدد ایسے اقدامات و بیانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جن سے جغرافیائی بنیاد پر قوم کی تشکیل کے نظریے کی پرزور وکالت کی گئی ہے وہ نہیں سوچتے کہ سر سید کے مستقل افکار، ان کی پوری زندگی اور غلامانہ سیرت کو نظر انداز کر کے بعض جزوی، غیر متعلق اور غیر اہم واقعات سے استدلال کر کے تاریخ پر کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ نئی نسل پر جب مطالعہ و تحقیق کی راہیں کھلیں گی اور ان کے قلم کے فریب کا پردہ چاک ہو گا تو وہ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی؟

(باقی ص ۳۰ پر)

قاضی خان ۔ لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا بیان ہے کہ مجھ پر وحی کے ذریعہ کتاب نازل ہوئی ہے اور اس میں چالیس پارے ہیں ۔

بایزید ۔ مخالفین غلط کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الہامی طریقہ پر میرے دل پر ایک کتاب نازل کی ہے جس کا نام خیر البیان ہے جس میں چالیس بیانات ہیں جس طرح کہ عبدالقادر جیلانیؒ پر الہامی طور پر غوثیہ نازل ہوئی ۔ عام طور پر لوگ الہام اور وحی میں فرق نہیں سمجھ سکتے ۔ اس لئے اسے وحی کہتے ہیں ۔ اور میرے حاسدین حسد کی بنا پر یہ طعنہ دیتے ہیں کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے"[9]۔

اس گفتگو کے بعد بایزید نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ۔

"میرا طریقہ اویسیہ ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ عنایت فرمایا ہے مجھے علم لدنی سے بہرہ ور کیا اور قرآن کے معانی مجھ پر کھول دئے"[12]

"قاضی خان اس گفتگو کے بعد بایزید کو مرزا حکیم کے پاس لے کر آئے اور کہا اے مرزا حکیم یہ شخص مرد کامل اور ہے اور حاسدوں نے اس پر اختراع کیا ہے ۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا پیر بابا اور ان کے خلیفہ اخوند درویزہ نے ذاتی بنا پر اس تحریک کی مخالفت سلسلے میں بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخوند درویزہ اور بایزید کی باہمی مخالفت اس بنا پر نہ بایزید نے اخوند درویزہ کی شخصیت پر کوئی حرف گیری کی تھی یا اس کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی تھی سوال کہ کیا یہ اختلافات مناسب تھے یا نہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ اس سے قبل مسئلہ وحدۃ الوجود اور مخالفین کے درمیان یہ اختلافات رہ چکے ہیں ۔ اور جس طرح بایزید پہلی شخصیت نہ تھی کہ جس نے الوجود کے مسئلہ پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی اسی طرح پیر بابا اور اخوند درویزہ کی مخالفت بھی کوئی نہ تھی ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حضرات جو اس عقیدے سے متفق نہ تھے انہوں نے بھی تنقید ادب واحترام کو ملحوظ رکھا ہے ۔

مثلاً حضرت مجدد الف ثانی وحدۃ الوجود کے رد میں فرماتے ہیں ۔

اشیاء صوفیہ کے نزدیک اللہ کے مظاہر ہیں اور یہ بات علماء کو بھی پسند ہے لیکن فرق یہ ہے کہ علماء اس پرہیز کرتے ہیں تاکہ حلول اتحاد کا وہم پیدا نہ ہو ۔ صوفیہ اور علماء دونوں کے خیال میں اشیاء کا وجود ہیں نہیں ہے ۔ صوفیہ اس وجود کو وہم کہتے ہیں کیونکہ زمانہ روح میں یہ حق تعالیٰ کے وجود کے بغیر اور کچھ تھے اور علماء وحدۃ الوجود کے لفظ سے اس لئے کتراتے ہیں تاکہ کوتاہ نظری کے اس پیمانے سے ثواب کے منکر نہ ہو جائیں"[13]۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود

نسب اکتیسویں واسطہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے[۲]

بایزید جالندھر میں پیدا ہوئے (۹۳۱ھ) لیکن آپ کے والد نے ایک پیدائش کے بعد صوبہ سرحد کے علاقہ جنوبی وزیرستان کو ہجرت کی[۳] بایزید نے یہیں پرورش پائی۔ اور تکمیل علم کے بعد لوگوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا آپ کی ان کوششوں نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس خطے کے مسلمانوں پر اس کے ادبی ثقافتی مذہبی اور سیاسی اثرات چھوڑے۔

روشنیہ تحریک کی بڑھ چڑھ کر مخالفت پیر بابا[۳] اور ان کے خلیفہ[۴] اخوند درویزہ نے کی۔ اخوند درویزہ نے بایزید پر حسب ذیل الزامات عائد کئے :۔

"بایزید کا عقیدہ باطن تھا۔ اپنی اتباع لوگوں کے لئے ضروری قرار دیتا تھا۔ نبوت کا مدعی تھا۔ اپنی کتاب خیر البیان کو الہامی کہتا کہ یہ خدا نے مجھ پر نازل کی ہے۔ اس کی کتابوں میں اکثر احادیث موضوع ہیں۔ اس نے جوگیوں سے عقیدہ تناسخ کا اثر قبول کیا جس میں انسان اپنے اعمال کی بنا پر مختلف جسم بدلتا ہے۔ اور حیوان کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ حشر و نشر کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ جو جسم حلال یا حرام میں بڑھے اگر ایک مرتبہ فنا ہو جائے تو دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس کے مرید ہو جاتے وہ آخر کار نماز اور نیک اعمال چھوڑ کر لوٹ مار، بدکاری اور علماء کی مخالفت پر اتر آتے"[۵]

اخوند درویزہ نے بایزید پر جو الزامات عائد کئے ہیں اگر غیر جانب داری کے ساتھ ان کا جائزہ لیا جائے تو ان کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ ان میں سے اکثر الزامات کا جواب بایزید انصاری نے بذات خود اس وقت دیا جب مرزا حکیم حکمران کابل کے کہنے پر قاضی خان نے جو اس وقت کے جید عالم اور صوفی تھے بایزید سے کچھ سوالات کئے ان دونوں حضرات کی گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔

"قاضی خان۔ سنا گیا ہے کہ تم کہتے ہو کہ مجھ پر وحی آتی ہے"[۶]

بایزید۔ "غلط کہتے ہیں میں تو کہتا ہوں کہ مجھ پر الہام ہوتا ہے۔ اور میں غیب کی آواز سنتا ہوں"[۷]

"قاضی خان۔ تم وسوسہ و الہام اور آواز رحمانی اور شیطانی میں کس طرح فرق سمجھتے ہو"[۸]

بایزید۔ میں الہام و وسوسہ اور ندائے رحمانی اور شیطانی میں حدیث اور مشائخ کے اقوال سے فرق معلوم کرتا ہوں۔ جو ندا اور الہام آیات قرآنی، احادیث اور اقوال مشائخ کے مطابق ہو اسے ندائے رحمانی اور الہام سمجھتا ہوں اور جو آیات قرآنی اور حدیث کے مطابق نہ ہو اسے شیطان مردود کی پناہ مانگتے ہوئے رد کر دیتا ہوں"[۹]

کے عوام میں تزکیہ نفس، حسن اخلاق، بلندی سیرت و کردار، تفکر و تعقل اور حصول علم کے جذبات ابھارے اور اس طرح پورے معاشرے میں مذہبی لگن پیدا کی جس کا اثر آج بھی اس خطے میں موجود ہے اور یہاں کی اکثریت صحیح معنوں میں اسلامی اقدار کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

ادبی اور ثقافتی اثرات | خیر التوحید۔ خیر البیان اور فخر الطالبین بایزید کی وہ تصانیف ہیں جن کی وجہ سے عوام اور خواص دونوں میں علمی اور ادبی صلاحیتیں پیدا ہوئیں۔ خاص کر خیر البیان جو پشتو کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جو آج تک پوری ہم تک پہنچی ہے اور پشتو ادب کا سارا سلسلہ بھی اسی کتاب سے شروع ہوتا ہے[۱۸]۔ بلکہ خوشحال خان خٹک نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس دور کے دیگر علماء اور نقاد بایزید کی خیر البیان کو سمجھ ہی نہیں سکا۔

" اخوند درویزہ نے پیر روشن بایزید انصاری کی خیر البیان کو دیکھا لیکن اس کے مضمون کو نہ سمجھ سکے[۱۹]۔ بایزید کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ خیر البیان میں وہ بیک وقت عربی، فارسی، ہندی اور پشتو کی عبارات کا استعمال کرتے ہیں[۲۰]۔ اس طرح بایزید نے ان تصانیف سے عوام اور خواص دونوں میں علمی اور ادبی صلاحیتیں پیدا کیں۔ تاکہ وہ پشتو زبان میں اپنا سرمایہ چھوڑ جائیں۔ اور یہ ایک مسلم بات ہے کہ جب بھی قومیں اخلاقی اقتدار پر غور کرتی ہیں تو ضرور انہیں ثقافتی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پشتو موسیقی کا ارتقاء بایزید اور ان کے پیروکاروں ہی کی وجہ سے ہوا۔ ان لوگوں نے پشتو موسیقی میں بنیادی تبدیلی کی۔ اور نئے سُر ایجاد کئے۔ " برصغیر پاک و ہند کے شمال مغربی علاقے کے لوگوں کو علم موسیقی کا خزانہ بایزید انصاری کے مرید حاجی محمد کے طفیل ملا "[۲۱]

سیاسی اثرات | اگرچہ روشنیہ تحریک ایک خالص دینی تحریک تھی لیکن ایک واقعہ نے اس تحریک کو سیاسی جامہ پہنا دیا۔ اور پھر پوری ایک صدی تک ہندوستان کے حکمرانوں کو اس تحریک کے ختم کرنے میں اپنی پوری قوت استعمال کرنی پڑی۔ اس واقعہ کا ذکر بایزید کی خودنوشت سوانح عمری میں اس طرح کیا گیا ہے۔

ایک قافلہ ہندوستان سے واپس کابل جا رہا تھا کہ راستے میں اس نے پڑاؤ کیا۔ جہاں بایزید کے انتہائی پرجوش مرید رہتے تھے۔ قافلہ والوں کی حرکات و سکنات سے انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ لوگ فکر آخرت سے بالکل غافل ہیں۔ جس پر ان مریدوں نے قافلے والوں پر حملہ کر کے ان کا مال و متاع ضائع کر دیا۔ کابل کی حکومت نے انتقامی کارروائی کی اور ان لوگوں کو قتل کر کے ان کے بال بچوں کو گرفتار کر کے کابل لے گئے۔ جس پر بایزید نے کابل کی حکومت سے تحریری احتجاج کیا۔ کابل کی حکومت نے پشاور کے حاکم کی معرفت بایزید کی گرفتاری کا حکم دیا۔ بایزید کا محاصرہ کیا گیا لیکن بایزید محاصرہ توڑ کر تیراہ کی پہاڑیوں میں چلے گئے اور اس پہلے معرکے

کارو کیا ہے لیکن علمی طریقہ سے اخوند درویزہ کی طرح سخت کلامی اختیار نہیں کی اور اخوند درویزہ کی اسی سخت کلامی سے بایزید کے معتقدین نے فائدہ اٹھایا اور
یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ پیر بابا اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت مغل حکمرانوں کی ہمدردی میں تھی[۱۴] جب
ایسا نہیں تھا اس لئے کہ جب بایزید نے اکبر کو مذہبی شخصیت کی حیثیت سے اپنے افکار سے آگاہ کیا
اکبر نے بایزید کو ہر ممکن تعاون کا نہ صرف یقین دلایا بلکہ نہایت واضح طور پر کہا کہ میں نے شیخ کی پیروی نہ کی
اور جو خدمت وہ کہیں میں بجالانے کے لئے تیار ہوں اور پھر تحائف بایزید کے لئے بھجوائے اور اس کے
خلیفہ کو بھی خلعت سے نوازا[۱۵]

اگر پیر بابا اکبر کے اپنے نمائندے ہوتے تو اکبر بایزید کو مذہبی شخصیت کی حیثیت سے کیسے قبول کرتا
اکبر نے تو روشنیہ تحریک کی مخالفت اس وقت کی جب اسے اپنا سیاسی اقتدار گھٹتا ہوا نظر آیا۔ جہاں تک
بایزید کی تحریک کا تعلق ہے تو اس خطے کے رہنے والوں پر اس کے مذہبی معاشرتی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی
اثرات مرتب ہوئے۔

مذہبی اور معاشرتی اثرات | بایزید نے اپنی تحریک خود اعتمادی اور روحانی تزکیہ کی بنیاد پر شروع کی
انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی تعلیم دیں تاکہ لوگ اپنی
روش چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کریں۔ لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور خالص دین کی اشاعت کے
سینہ سپر ہو گئے۔ اور یہ تعلیم دی کہ ظاہری عبادات کا کوئی اثر نہیں ہوتا جب تک کہ انسان بدنی طہارت، قلبی
صفائی اور روحانی تزکیہ حاصل نہ کرے۔

بایزید کی اس تعلیم و تربیت کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے غلط روایات کو ترک کر دیا حصول علم اور عبادات
کے شوق میں مگن ہو گئے اور اس طرح پورا معاشرہ حصول خیر و فلاح کی طرف راغب ہو گیا۔ جس کا اعتراف
اخوند درویزہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

جب میں بایزید کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا تو صبح کی نماز میں وہ آگے ہوا اور اس کے مریدوں نے اس کے پیچھے
نماز پڑھی[۱۶] اسی طرح بایزید نے حکمرانوں کو اصلاح کی جانب راغب کیا تاکہ ان کی اتباع میں عوام
اپنی اصلاح کریں۔ چنانچہ بایزید نے مذہبی تبلیغ کا فریضہ اس انداز میں ادا کیا۔

"اے حکمرانو تمہارے دین اور ایمان کے سلسلہ میں میری عرض ہے کہ میری بات سنو اور وہ یہ
شریعت پر ثابت قدم رہو اور دوسرے لوگوں کو بھی ثابت قدم رہنے کی تاکید کرو تاکہ وہ اخلاص کو اختیار
کریں اور فرشتے نیکیوں کی کتاب میں ان کی بہت سی نیکیاں اور احسان لکھیں[۱۷] دراصل بایزید نے
دعوت میں بادشاہوں، امراء اور قومی سرداروں کو مخاطب کیا اور اپنے مذہبی افکار کے ذریعہ اس نے

تکمیل کے بعد صوبہ سرحد کی وادی سوات کے مقام پاچہ کلے میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور وہیں ۹۹۱ ہجری میں انتقال فرمایا۔ (۴) اخوند درویزہ کا نام عبدالرشید تھا آپ پیر بابا کے خلیفہ اور بڑے عالم و زاہد تھے۔ کئی کتب کے مصنف ہیں۔ آپ ۹۴۰ ہجری میں سوات میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴۸ھ میں وفات پائی۔

۵۔ اخوند درویزہ "تذکرۃ الابرار والاشرار" پشاور۔ مطبع محمدی ۱۹۲۰ء ص ۱۳۷ تا ۱۴۶

۶ تا ۱۲۔ قاسمی عبدالقدوس (مرتب) خیر البیان۔ از بایزید انصاری پشاور پشتو اکیڈمی ۱۹۶۷ء ص ۷۸، ۷۷

۱۳۔ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مکتوبات مجدد الف ثانی امرتسر مطبع اردو بازار ۱۳۴۰ھ مکتوب ۲ جلد ۲

۱۴۔ پیر بابا کے والد سید قنبر علی ہمایوں کے دربار میں ایک فوجی عہدے پر فائز تھے۔ اور پیر بابا بھی اکثر اپنے والد کے ہمراہ دربار میں آتے جاتے تھے جس بنا پر یہ کہا گیا کہ پیر بابا مغلوں کے طرفدار تھے لیکن پیر بابا کا عمل اس کی نفی کرتا ہے۔ بایزید انصاری کی کتاب "تذکرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ کس طرح آپ نے درباری زندگی کو خیر باد کہا اور والد سے الگ ہو کر حصول علم و معرفت کے لئے ہندوستان کا سفر کیا۔

۱۵۔ مخلص علی محمد (مرتب) حالنامہ از بایزید انصاری، پشاور پشتو اکیڈمی لائبریری مائیکرو فلم و ٹائپ نسخہ

۱۶۔ اخوند درویزہ "تذکرۃ الابرار والاشرار۔ محولہ بالا ص ۱۴۲

۱۷۔ عبدالشکور (مرتب) صراط التوحید۔ از بایزید انصاری، پشاور۔ ادارہ اشاعت سرحد ۱۹۵۲ء، ص ۲۷۱

۱۸۔ قاسمی عبدالقدوس (مرتب) خیر البیان۔ از بایزید انصاری، محولہ بالا ص ۱۳

۱۹۔ ختک خوشحال خان۔ صوات نامہ۔ پشاور۔ پشتو اکیڈمی لائبریری، مخطوطہ ص ۱۸

۲۰۔ خیر البیان۔ محولہ بالا کے ص ۱ تا ۳۰ کی تحریروں میں اسی طرح کی گفتگو درج ہے۔

۲۱۔ مخلص، علی محمد (مرتب) حالنامہ از بایزید انصاری محولا بالا ص ۴۵۳ - ۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ یوسفی اللہ بخش۔ سرحد اور جدوجہد آزادی۔ لاہور۔ مرکزی اردو بورڈ۔ ۱۳۸۸ھ ص ۴۶

۲۴۔ ندوی۔ ابوالحسن علی سید۔ سیرت سید احمد شہیدؒ۔ لکھنؤ نامی پریس ۱۳۳۹ھ ص ۱۹۶

۲۵۔ جعفری، رئیس احمد (مرتب) خطبات قائداعظم۔ قائداعظم محمد علی جناح کا ۱۹۴۸ء میں پشاور کے مقام پر قبائلی جرگہ سے خطاب، جسے شعاع ادب لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

نظامِ ہضم کی سہارو برداشت کی ایک حد ہے
اس پر زیادہ بار نہ ڈالیے۔
ہمیشہ سادہ اور زود ہضم غذا کھائیے
لیکن لذّتِ کام و دہن اگر بد پرہیزی پر
مائل ہی کر دے تو اس کے اثرات کی اصلاح کارمینا سے کیجیے۔
کارمینا
بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، تیزابیت وغیرہ کا اچھا علاج ہے
ہمدرد
Carmina
See literature enclosed
کارمینا ہر گھر کی لازمی ضرورت
Adarts
CAR-6/80

از جناب لفٹیننٹ کرنل محمد اعظم ، کوڑہ خٹک

اسلام کے ایک جلیل القدر جرنیل و سیاستدان

فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ

پہلی صدی ہجری میں سلطنت اسلامیہ کی بنیادیں جن چار ستونوں پر اٹھائی گئیں۔ وہ ستون فاتح عراق وجزیرہ خالد بن ولیدؓ، فاتح فلسطین ومصر عمرو بن عاصؓ۔ فاتح شام ابو عبیدہ بن جراحؓ۔ اور فاتح قادسیہ و مدائن حضرت سعد بن وقاصؓ ہیں۔ گو خالد بن ولید اپنی بے مثل شجاعت اور جنگی مہارت کے باعث دنیا کے عظیم فاتح جرنیلوں کی صف اول میں گنے جاتے ہیں۔ اور فتوحات عراق وجزیرہ معرکہ ہائے شام و یرموک اور سرکوبی فتنہ ہائے مرتدین نے ان کو دوسروں کے مقابلے میں ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ مگر عمرو بن عاص کے کارنامے جو اپنے وقت کا بہترین فوجی جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مدبر۔ عدل و رواداری کا پیکر۔ انتظامی قابلیت میں یکتا اور اسلام کا خادم حقیقی تھا۔ کسی طرح خالد بن ولید سے کم نہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جو ابتدائی ایام میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ ایک ہی دن مدینہ پہنچے ایک ہی وقت میں ایمان لائے۔ اور اسلام کے پھیلانے میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو کسی اور کو کم نصیب ہوئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہ دونوں سپہ سالار تمام اسلامی جنگوں میں بلا استثنا کامیاب رہے۔ ہر معرکہ میں فتح حاصل کی۔ اور کہیں سے ناکام نہیں لوٹے۔ دونوں حملہ میں بے باک۔ ذاتی شجاعت میں فرزانگی کی حد تک نڈر اور کم تعداد کے ساتھ بڑے بڑے معرکے سر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ عمرو بن عاصؓ اس لحاظ سے منفرد مقام رکھتے ہیں کہ جنگی قابلیت کے ساتھ ساتھ قدرت نے ان کو سیاسی بصیرت کے بیش بہا خزانے سے نوازا تھا۔ اور انتظامی مسائل حل کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔ تدبیر و انتظام کی یہ صفات دیکھ کر ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عمان بھیجا۔ اور پھر وہاں کا والی مقرر فرمایا۔

حضرت ابو بکرؓ نے بھی آپ کو دوسروں پر ترجیح دی اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے جن کی مردم شناسی ضرب المثل تھی۔ عمرو بن عاص کو ہمیشہ معتمد خاص کا درجہ دیا اور اہم مہمات ان ہی کے سپرد کیں۔ عمان میں تبلیغ اسلام اور مصر میں رعایا کے ساتھ حسن سلوک نے ان کو اس قدر ہر دلعزیز بنا دیا تھا کہ اہل مصر ان کو

اپنا مربی اور سرپرست سمجھتے تھے۔ مصر میں انہی کے زیر اثر لاکھوں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اور گھر گھر اسلام کی اشاعت ہوئی۔

عمرو بن عاصؓ قریش کے قبیلہ بنی سہم سے تعلق رکھتے تھے جو قبائل قریش میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا اہل عرب کے بڑے بڑے تنازعات کا فیصلہ اکثر رؤسا بنی سہم ہی کیا کرتے تھے۔ یہ قبیلہ اسلام کے سخت مخالفین میں سے تھا اور عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل جو بنی سہم کے نامور سردار تھے آں حضرتؐ اور صحابہ کرامؓ سے دشمنی اور ایذا رسانی میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ (نبی کریمؐ کے دونوں بیٹوں کی وفات کے بعد حضورؐ کو ابتر کہنے والے عاص بن وائل ہی تھے جس پر سورہ کوثر نازل ہوئی)

عمرو بن عاصؓ کی پیدائش اور تربیت مکہ میں ہوئی۔ آپ نے پیشہ تجارت کے ساتھ ساتھ سپہ گری اور شہسواری کا فن بھی سیکھا۔ جو شرفائے عرب کے لئے سب سے بڑا جوہر سمجھا جاتا تھا۔ عمرو بن عاص آں حضرتؐ سے عمر میں چھ سال چھوٹے تھے۔ اور سلمہ نابغہ جو قبیلہ بنی عذرہ سے تھیں بطن سے پیدا ہوئے۔ عاص بن وائل کی دوسری بیوی ام حرملہ حضرت عمرؓ کی خالہ تھیں۔ عمرو بن عاص نے حجاز کے مروجہ دستور کے مطابق باقاعدہ تعلیم تو کہیں حاصل نہ کی مگر جوانی میں اپنی تجارتی ضروریات کے پیش نظر کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ چونکہ ان کا قبیلہ دوسرے قریش قبائل کی نسبت شعر وادب کا ذوق زیادہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس ذوق کی جھلک آپ کے ان خطوط میں ملتی ہے، جو آپ نے وقتاً فوقتاً حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو لکھے۔

عمرو بن عاصؓ عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے۔ اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ آپ کے حسن ظرافت کا اندازہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ایک مکالمے سے ہوسکتا ہے۔ جن سے ان کا اختلاف اُن کی نرم پالیسی اور بنی امیہ کی طرف سے بڑے بڑے عہدوں پر کنٹرول اور انتظامی امور میں مداخلت کی وجہ سے ان کی علیحدگی کا سبب بنا تھا۔ آپ جب مصر کے والی کا عہدہ حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد کے حوالے کرکے مدینہ واپس لوٹے تو خلیفہ وقت سے ملاقات کے وقت آپ ایک روئی بھرا لبادہ پہنے ہوئے تھے۔ تلخی گفتگو کو مٹانے اور موضوع کو بدلنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے لبادہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اس میں کیا بھرا ہوا ہے۔ تو عمرو بن عاص کا مختصر جواب تھا "عمرو بن عاص"

خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ کے اسلام لانے سے آں حضرتؐ بہت خوش ہوئے تھے اور اس کے جنگی مہموں میں دوسرے صحابہ کی نسبت زیادہ کام انہی سے لیا۔ پہلا کام جس کے لئے آنحضرتؐ نے عمرو بن عاص کو چنا وہ قبیلہ بنی قضاعہ کی سرکوبی تھی۔ جو مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کررہے تھے۔ آپؐ نے تین سو افراد پر مشتمل ایک جماعت ان کے ہمراہ بھیجی۔ منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی عمرو بن عاصؓ کو اپنی قلیل تعداد کا احساس ہوا اور مزید مدد مانگی۔

ہ نے فوراً دو صد مہاجر اور انصار کا ایک دستہ ابو عبیدہ رضؓ کے زیر کمان روانہ کیا اور ساتھ ہی نصیحت
ا عمرو بن عاص رضؓ سے اختلافی مسائل میں الجھنے سے احتراز کرنا۔ جب یہ جماعت پہلے دستہ میں شامل ہوئی
ابو عبیدہؓ نے کمان سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر عمرو بن عاص نے اس مہم کی ذمہ داری ابو عبیدہ کے حوالے
سے انکار کر دیا۔ آپ کا موقف یہ تھا کہ ابو عبیدہ کی جماعت ان کی کمک کے طور پر آئی تھی لہٰذا وہ بھی
تابع تھی۔ حالات بگڑنے سے پہلے ابو عبیدہ کو آں حضرت کی نصیحت یاد آگئی اور اطاعت اختیار کر لی۔
دشمن بھاری تعداد اور اسلحہ سے لیس ہو کر آئے تھے مگر بری طرح شکست کھا کر بھاگے۔ مسلمانوں نے
تعاقب کرنا چاہا۔ مگر عمرو بن عاص نے روک دیا۔ سردی کا موسم تھا لوگوں کی خواہش تھی کہ آگ جلا کر
جائے لیکن امیر لشکر نے اس کی بھی سختی سے مخالفت کر دی۔

لشکر میں موجود صحابہ کو یہ دونوں باتیں ناگوار گذریں اور واپسی پر آں حضرتؐ سے شکایت کی۔ آپؐ نے
عاص کو طلب فرما کر باز پرس کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ دونوں احکام اپنی تعداد چھپانے اور شب خون
کم کرنے کے لئے انہوں نے سوچ بچار کے بعد دیے تھے۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں وجوہات
ائیں اور عمرو بن عاص رضؓ کی جنگی بصیرت کی تعریف کی۔

دوسری بڑی مہم جو آنحضرتؐ نے عمرو بن عاص کو اپنی زندگی میں سونپی وہ ملک یمن میں عمان کی مجوسی
ت کے حکمران کو قبول اسلام کی دعوت دینا تھا۔ کچھ رد و کد کے بعد عمان کے رئیس ایمان لے آئے۔ لہٰذا
کی تقسیم اور دوسرے انتظامی امور عمرو بن عاصؓ کے سپرد کر دیے جن کی فہم و فراست سے وہ بہت متاثر
تھے۔ آپ یہاں دو سال رہے اور بطور والی اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے۔ اس علاقے کے اکثر
ے آپ ہی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے۔ آنحضرت کی وفات کی خبر آپ کو عمان میں ملی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لاتعداد نبی پیدا ہو گئے۔ اور قبائل عرب میں مرتدین کا
برپا ہوا۔ جس کا فوری خاتمہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلام کی بقا کے لئے ضروری سمجھا۔ خلیفہ وقت نے
جہاد کے لئے فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے ایسے امیر مقرر کئے جو ان مہمات کو سر کرنے کی قابلیت رکھتے
اس میں عمرو بن عاص کو عمان سے واپس طلب کیا گیا۔ اور بنی قضاعہ کی مہم ان کے سپرد کی گئی۔ یہ وہی قبیلہ تھا
کو عمرو بن عاص شکست دے چکے تھے۔ اور لوگ اب تک ان کے نام سے خائف تھے۔ آپ اسی پر اسے
سے گئے اور بنی قضاعہ کو شکست دے کر اسلام پر قائم کیا۔ اور مکمل فتح و کامرانی کے بعد واپس لوٹے
فتنہ ارتداد کے فرو ہونے کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کو دوبارہ والی مقرر کر کے عمان بھیج دیا۔ مگر جلد
ان کو خلیفہ کا ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں تحریر تھا۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تم کو سریہ بنی قضاعہ کا امیر بنایا تھا۔ پھر عمان کا والی مقرر کیا۔ اسی لحاظ سے میں نے بھی بنی قضاعہ کی مہم دوبارہ تمہارے سپرد کی اور اس کے بعد عمان واپس کیا۔ مگر اب چاہتا ہوں کہ اگر تم پسند کرو تو ایک ایسا کام تمہارے سپرد کروں جو موجودہ کام سے دین و دنیا دونوں میں زیادہ مفید ہو۔"

عمرو بن عاص کا جواب مختصر مگر صاف تھا۔ انہوں نے لکھا:۔

" میں اسلام کے ترکش کا ایک تیر ہوں اور آپ تیر انداز۔ جس پہلو سے کوئی خطرہ نظر آئے اس طرف بے تکلف تیر کو چلائیے۔"

مملکت اسلامیہ کو نیا خطرہ شامیوں کی طرف سے تھا جو حضرت اسامہؓ کے ہاتھوں اپنی تباہی کا انتقام لینے اٹھے تھے۔ شامیوں کی مدد کے لئے قیصر روم ہرقل خود ایک جرار لشکر لے کر عرب اور فلسطین کی سرحد تک آ پہنچا تھا وہ دونوں پوری طاقت سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس خطرے کا سدباب کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبائل عرب کے ۳۶ ہزار مجاہدین کو جمع کر کے چار حصوں میں ترتیب دیا۔ اور شام کے چار صوبوں کی طرف روانہ کیا۔ فتح فلسطین کی ذمہ داری عمرو بن عاص کو سونپی گئی۔ جب کہ حمص۔ دمشق اور اردن ابوعبیدہ بن جراحؓ یزید بن ابی سفیانؓ اور شرجیل بن حسنہؓ کے حصے میں آئے۔

عمرو بن عاصؓ کو رخصت کرتے وقت خلیفۂ رسولؐ نے نصیحت کی۔

" تم ایلیا کی راہ سے جاؤ۔ اور فلسطین پہنچنے کے بعد ابوعبیدہؓ سے رابطہ قائم رکھنا اور اہم امور میں اس سے مشورہ لینا۔ وہ جس وقت امداد کے طالب ہوں ان کی مدد کرنا۔ اور ظاہر اور باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا کہ وہ سب پوشیدہ باتیں جانتا ہے۔ دیکھو میں نے تم کو ان لوگوں پر بھی ترجیح دی ہے جو حرمت اور اسلامی سبقت میں تم سے مقدم ہیں۔ لہذا تمہیں چاہیئے کہ تمہاری کوششیں آخرت کے لئے ہوں اور جہاد سے سوائے رضائے الہٰی کے اور کچھ مقصود نہ ہو۔ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اس میں مطلق سستی نہ کرنا اور کاہلی کو دخل نہ دینا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کہنے لگو کہ ابوبکرؓ نے مجھ کو ایسے دشمن کے مقابلہ میں بھیج دیا جس سے لڑنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ مہاجرین اور انصار ہیں جن میں اہل بدر بھی ہیں۔ ان کے حق حرمت کا خیال رکھنا۔ امارت کی وجہ سے ان پر فوقیت نہ جتانا۔ اور نہ شیطانی نخوت دل میں نہ لانا۔ کہ ابوبکر نے مجھ کو ان کا امیر اس لئے بنایا ہے کہ میں ان سے بہتر ہوں۔ نفس کے فریب میں نہ آنا۔ ان کے ساتھ مل جل کر رہنا اور معاملات میں ان سے مشورہ لینا۔ نماز میں ہرگز تساہل نہ ہونے پائے۔ جب وقت آجائے تو اذان

دلوا کر جماعت کے ساتھ پڑھنا۔ دشمن کی طرف سے غفلت نہ کرنا۔ ان کے حالات سے خبردار رہنا۔ سپاہیوں کو پاسداری کے لئے متعین رکھنا۔ راتوں کو اصحاب کے ساتھ بیٹھنا اور ان کے خیالات کو دیکھنا۔ معرکہ میں خوفِ خدا کو پیش نظر رکھنا۔ فوج کو اگر نصیحت کرنا تو مختصر۔ اور پہلے خود اس پر عامل ہو جانا۔ اس سے ان کی اصلاح ہو گی۔ دشمن سے مقابلہ میں صبر و ثبات سے کام لینا اور قدم ہرگز پیچھے نہ ہٹانا۔ سپاہیوں کو قرآن کی تلاوت کا پابند بنانا۔ دنیاوی خرافات سے کنارہ کش رہنا کہ ان امہ میں تمہارا شمار ہو جن کی مدح قرآن میں ہے۔"

ان نصائح کے بعد فرمایا کہ جاؤ خیر و برکت اور رحمت خداوندی تمہارے ساتھ ہو۔

عمرو بن عاصؓ نو ہزار کا لشکر لے کر فلسطین روانہ ہوئے۔ قیصر کو جب اسلامی فوجوں کی آمد کی خبریں پہنچیں تو اس نے اس جنگی حکمتِ عملی کو سامنے رکھا کہ ہر اسلامی لشکر کے مقابلے میں کثیر التعداد رومی افواج بھیجی جائیں۔ ان سے علیحدہ علیحدہ جنگ کی جائے اور انہیں کسی مقام پر اکٹھا نہ ہونے دیا جائے۔

فلسطین میں عمرو بن عاص کا مقابلہ کرنے کے لئے قیصر کا حقیقی بھائی تذارک تقریباً نوّے ہزار کی جمعیت لے کر مقابلہ کو آیا۔ شروع شروع میں رومی فوج کی کثیر تعداد کا سن کر مسلمانوں نے خطرہ محسوس کیا۔ مگر بعد کی لڑائیوں نے اس خطرے کا وجود معدوم کر دیا۔ فلسطین کے پہلے معرکے میں پہلے روز عمرو بن عاصؓ نے ایک جانب سے ایک ہزار سواروں کے ساتھ عبداللہ بن عمرؓ خطاب کو بھیجا۔ اور اتنی ہی تعداد ساتھ لے کر دوسری جانب سے خود حملہ آور ہوئے اور صفیں چیرتے ہوئے لشکر کے قلب میں رومی سردار تک جا پہنچے اور ایسا وار کیا کہ وہ پھر نہ اٹھ سکا۔ یہ عالم دیکھ کر رومی لشکر بھاگ اٹھا۔ اور مسلمان جو تھوڑا بہت خوف اپنی قلیل تعداد کی وجہ سے دلوں لئے ہوئے تھے ان کی ہمتیں بڑھ گئیں۔

دوسرے روز کے معرکے میں رومی عظیم الشان لشکر لے کر صف آرا ہوئے۔ مگر مسلمان سپاہی جو جذبہ جہاد سے سرشار اور ثواب آخرت کے فضائل اپنے سپہ سالار کی زبانی سن کر آئے تھے۔ قرآن کی آیتیں پڑھتے ہوئے اس بے جگری سے رومیوں پر حملہ آور ہوئے کہ غنیم حملہ کی تاب نہ لا کر کثیر تعداد کے باوجود میدان چھوڑ گیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور بہت سا ساز و سامان انہیں مال غنیمت میں ملا۔

رومیوں کی حکمتِ عملی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ تھی کہ چاروں اسلامی لشکر جن کو علیحدہ علیحدہ ذمہ داری دی گئی تھی، اور جو تعداد میں بھی کم تھے انہیں اکٹھے نہ ہونے دیا جائے۔ انہیں باری باری شکست دی جائے۔ اور اس طرح ان اسلامی فوجوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اسی حکمتِ عملی کو مدنظر رکھ کر رومی اسلامی فوجوں کو مقامی جنگوں میں

الجھائے رکھنا چاہتے تھے۔

عمرو بن عاصؓ جو جنوب میں رومی فوجوں سے برسرپیکار تھے اور کم تعداد کی وجہ سے خطرے سے تھے۔ اس خطرے کو قبل از وقت بھانپ لیا تھا۔ آپ نے ابوعبیدہ کو لکھا کہ بہتر ہوگا اگر ہم سب ایک مقام پر ہوجائیں اور رومیوں کی کثیر تعداد کا مقابلہ مل کر کریں۔ عمرو بن عاص کی اس صائب رائے کو سب امراء نے پسند کیا اس کی اطلاع خلیفہ کو مدینہ میں دے دی گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے شام میں اسلامی فوجوں کی قلیل تعداد اور رومیوں کی تیاریوں کے پیش نظر خالد بن ولیدؓ کو عراق سے شام پہنچنے اور ابوعبیدہؓ کو مدد کرنے کا حکم دیا۔ شام میں تمام اسلامی فوجوں کی قیادت ابوعبیدہؓ کے سپرد تھی۔ مگر خالدؓ کی آمد پر جنگی حکمت عملی طے کرنے کا اختیار کل انہوں نے سیف اللہؓ کو سونپ دیا۔ شام پہنچنے کے بعد خالد نے حالات کا جائزہ لے کر ہدایات جاری کیں کہ تمام لشکر جنوب میں اجنادین کے مقام پر جمع ہوں۔

عمرو بن عاص نے اجنادین پر اجتماع کی خبر سن کر اجنادین کے جنوب میں جہاں سے نزدیک تھا قیام پذیر لیشو کر لی۔ اور اپنے لشکر کے تین چھوٹے دستے غزہ، رملہ اور بیت المقدس کے رستوں پر رومی لشکر کو روکنے کے لئے دے تاکہ اجنادین پر اجتماع سے پہلے اسلامی لشکر جو طویل فاصلے طے کر کے آرہے تھے جمع گاہ پر پہنچنے سے پہلے ہی نہ الجھ جائیں۔ خالد بن ولید اسلامی فوجوں کی امداد کے لئے ایک لشکر جس کی تعداد بعض مورخین نے ۹ ہزار بتائی ساتھ لے کر آئے تھے اور حیرہ سے بارہ سو میل کا سفر کرتے ہوئے اجنادین کی سمت پیش قدمی کے لئے ایک ایسے رستہ کو اختیار کیا تھا جو پانی کی قلت اور دشوار گذاری کے سبب کسی فوجی لشکر کی گذرگاہ کے طور قطعی ناموزوں اور پر سفر رومی جرنیلوں کے نزدیک غیر ممکن تھا۔

اجنادین کے میدان میں مسلمان فوجوں کے بروقت اجتماع اور بے پناہ جذبہ جہاد نے نوے ہزار کے عظیم الشان لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اور رومیوں کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ اجنادین کے بعد یرموک میں بھی اسلامی نے اپنے سے کئی گنا بڑی رومی فوج کو ایسی مکمل اور فیصلہ کن شکست دی جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے اور یرموک کی جنگوں میں خالد بن ولیدؓ کے ساتھ ابوعبیدہؓ بن جراح، شرجیل بن حسنہؓ، یزید بن ابوسفیانؓ اور عمرو جیسے تجربہ کار اور جری سپہ سالار موجود تھے۔ جن کی جنگی صلاحیتیں مسلم اور فن سپہ گری میں ان کا مقام کسی تعا محتاج نہ تھا۔

قیام فلسطین کے دوران عمرو بن عاصؓ اپنے مشن کے مطابق رومی فوجوں سے برسرپیکار رہے۔ اور فلسطین کے شہر تو نابلس، عمواس، یافا، عسقلان، رملہ، عکا، لد، جبلہ، بیت جبرین وغیرہ فتح کئے۔ جب ان کی جنگی مصروفیتیں کم ہوجاتیں تو وہ اپنی فوجوں کا کچھ حصہ پیچھے چھوڑ کر ابوعبیدہؓ سے جا ملتے۔ اور شام کی دوسری فتوحات میں ان

کیا کرتے۔ فلسطین میں صرف بیت المقدس ہی ایسا شہر رہ گیا تھا جو رومیوں کے قبضہ میں تھا۔ اور اس پر اسلامی فوجیں اس وقت تک تسلط حاصل نہ کر سکی تھیں۔ بیت المقدس پر رومی فوجوں کے اجتماع کا یہ عالم تھا۔ کہ فلسطین اور شام کے علاقوں سے تمام فوجیں اس شہر میں آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ وہ تعداد اور سامانِ حرب کے بل بوتے پر اس کو ناقابلِ تسخیر بنانا چاہتے تھے۔

بیت المقدس کا محاصرہ سب سے پہلے عمرو بن عاصؓ نے کیا۔ اس محاصرے میں ابو عبیدہؓ، خالد بن ولیدؓ اور یزید بن ابوسفیانؓ بھی بعد میں آ کر اپنے لشکروں سمیت شامل ہو گئے۔ یہ محاصرہ تقریباً چار ماہ تک جاری رہا۔ اور رومی فوجیں قلعہ بند ہو کر ایک عرصہ تک لڑتی رہیں۔ فوجی امداد کے راستے مسدود ہونے اور سامانِ رسد کے ہر طرف سے منقطع ہونے کی وجہ سے محصورین کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ لہٰذا مکمل تباہی سے بچنے کے لئے وہ امن کے طالب ہوئے اور شرط رکھی کہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ مدینہ سے خود آ کر صلح کی شرائط طے کریں اور معاہدہ امن پر دستخط کریں۔ اس امر کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی گئی جو ایک طویل مسافت کے بعد بیت المقدس پہنچے۔ خلیفۂ وقت کا یہ سفر اور بیت المقدس میں کسی شان و شوکت کے بغیر ان کی آمد اپنی سادگی، انکساری اور اسلامی مساوات کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

فتح بیت المقدس کے بعد حضرت عمرؓ کے شام کے دوسرے سفر کے دوران عمرو بن عاص خلیفۂ وقت سے تنہائی میں ملے اور مصر پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ شروع میں حضرت عمرؓ نے دور دراز سفر، طاعونِ عمواس کے باعث مسلمان لشکریوں کی اموات اور دوسرے مصائب و آلام کے پیشِ نظر پس و پیش کیا۔ مگر عمرو بن عاص کے عزم راسخ اور مسلسل اصرار کو دیکھ کر اس مہم کی اجازت دے دی۔

فتح مصر کی مہم کا آغاز عمرو بن عاصؓ نے صرف چار ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک ایسے نیم مسلح لشکر کے ساتھ کیا۔ جو اپنے وطن سے تقریباً دو ہزار میل دور، سامان حرب کی کمی اور رسد کے لئے مقامی ذرائع پر انحصار کے باوجود شکست کے نام سے ناآشنا رہا۔ اس کے برعکس رومی فوجوں سے جب بھی ان کا مقابلہ ہوا غنیم کی تعداد ہمیشہ چار یا پانچ گنا سے زیادہ، ہتھیار بہتر، سامانِ رسد وافر اور کمک پہنچانے کے لئے بہترین بحری جنگی بیڑہ ان کی پشت پر موجود رہا۔ مگر اس کے باوجود وہ اسلامی فوجوں سے کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اور ان کے طوفانی حملوں کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلے۔

حضرت عمرؓ سے اجازت طلب کرتے وقت عمرو بن عاص نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ رومی فوجیں جو شام اور فلسطین میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد مصر میں جمع ہو رہی تھیں۔ اگر بر وقت ان کا قلع قمع نہ کیا گیا تو اسلامی مقبوضات کے لئے وہ ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ بن سکتی تھیں۔ پیشتر اس کے کہ رومی فوجیں

کی شکست کے زخم مندمل ہوتے اور مسلمانوں کے دوبارہ مقابلے کے لئے وہ اپنے آپ کو منظم کرتے عمرو بن عاص ان کو سرزمین مصر سے بھی باہر نکال دینا چاہتے تھے۔ عمرو بن عاص کے مختصر اسلامی لشکر نے مصر کا وہ راستہ اختیار کیا جس پر ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام جیسی برگزیدہ ہستیوں نے سفر کیا تھا۔ یہ فوج دریائے سینا سے ہوتی ہوئی ۱۰ ذی الحجہ ۱۸ ہجری کو العریش پہنچی۔ اور اس کو بغیر کسی دقت کے فتح کر لیا۔ العریش سے نکل کر اسلامی لشکر فرما پہنچا۔ جو دریائے نیل کے کنارے آباد ایک پرانا اور بڑا شہر تھا۔ اور مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے اس اہم شہر کی حفاظت رومی فوجوں کے سپرد تھی۔ یہاں کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک رہا اور آخر کار ۱۵ محرم ۱۹ھ کو عمرو بن عاص فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہو گئے۔ فرما کے بعد بلبیس اور امّ دینین اسلامی فوجوں کے محاصرے میں آئے۔ اور ان کو بھی فتح کر لیا گیا۔ چار ہزار کی اس مختصر جمعیت نے پانچ ماہ کے عرصے کے اندر متعدد شہر اور دریائے نیل کے ساتھ ساتھ ۲۵۰ میل کا علاقہ فتح کر لیا۔ جب کہ اس علاقے میں رومی فوجوں کی تعداد اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ امّ دنین کے معرکے میں مسلمانوں کا جانی نقصان گو رومیوں سے بہت کم تھا مگر قلت تعداد کی وجہ سے یہ نقصان زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے اور رومیوں پر جلد از جلد مکمل فتح حاصل کرنے کے لئے عمرو بن عاص دربار خلافت سے کمک کے طالب ہوئے۔ مدینہ سے امداد آنے تک اسلامی سپہ سالار اپنی فوج کو مصروف رکھنے کے لئے نیل کے مغربی کنارے لے گئے۔ اور منف پر قبضہ کر کے فیوم کی طرف بڑھے اور اس کو محاصرے میں لے لیا۔ یہ محاصرہ مدینہ سے کمک آنے تک جاری رہا۔ جو بعد میں اٹھا لیا گیا تاکہ بابلیون کے نہایت اہم شہر کو جلد فتح کر لیا جائے۔ یہ شہر شمالی اور جنوبی علاقہ کے درمیان ایک اہم مواصلاتی اور تجارتی مرکز تھا۔ اور تقریباً ۲۰ ہزار رومی فوج اس کی حفاظت پر تعینات تھی۔ اس کے گرد و دور دور تک فوجی چوکیاں تھیں۔ جن میں رومی دستے مستقل موجود رہتے تھے۔ (رومیوں کے زمانہ میں یہ شہر موجودہ قاہرہ کے قرب وجوار میں واقع تھا آج کل اس شہر کا نام و نشان تک موجود نہیں) کمک کا دستہ جو بارہ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔ حضرت زبیر بن عوامؓ کی زیر قیادت ہیلیو پولس کے مقام پر حضرت عمرو بن عاص کے لشکر سے آملا اور پھر دونوں لشکر متحد ہو کر بابلیون کی طرف روانہ ہوئے۔ بابلیون کے قلعے کا محاصرہ سات ماہ تک جاری رہا۔ یہ قلعہ ناقابل تسخیر حد تک مضبوط اور محفوظ تھا۔ اور سامان رسد کے وافر ذخائر اس میں موجود تھے۔ اس قدر طویل محاصرے سے عرب اکتا گئے۔ مگر عمرو بن عاص نے اس محاصرے کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں کی فتوحات بھی جاری رکھیں۔ آخر کار قلعے کا محاصرہ تنگ کر دیا گیا اور زبیر بن عوام ایک رات موقعہ پاکر قلعے کی دیوار پر چڑھ گئے۔ انہوں نے محافظوں کا کام تمام کر کے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس طرح یہ قلعہ اسلامی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔

بابلیون کی فتح کے بعد عمرو بن عاص نے اسکندریہ پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ قسطنطنیہ کے بعد یہ

شہر رومی سلطنت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر کو سکندر اعظم نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط سمندری بیڑہ اور پچاس ہزار رومی فوج یہاں متعین تھی۔ سامان رسد اور اسلحہ کے بڑے ذخیرے یہاں موجود تھے۔ یہ شہر اپنی خوبصورتی کے علاوہ رومیوں کے لئے سیاسی اور فوجی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ فتح مصر کے آخری مرحلہ میں عمرو بن عاص کی فوجیں جب شمال مغرب کی جانب روانہ ہوئیں تو ان کی تعداد اٹھارہ ہزار ہو چکی تھی۔ اسکندریہ پہنچتے پہنچتے اسلامی فوجوں کو چند ماہ گذر گئے۔ مگر ان کی فتوحات جاری رہیں راستے میں اشمون علالیا۔ کوم۔ ما فوف۔ شیخ اور طنخ وغیرہ کے مضبوط قلعے اور شہر ان کے زیر تسلط آتے گئے۔ اور رومی فوجیں شکست پر شکست کھاتی ہوئی اسکندریہ کی طرف پیچھے ہٹتی گئیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۶۴۱ء میں اسلامی فوجوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ چار ماہ تک جاری رہا۔ عمرو بن عاصؓ نے اسکندریہ کی ناکہ بندی فوج کے ایک حصے کی ذمہ داری میں دے کر دیگر علاقوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر مدینہ میں محاصرہ طویل ہو جانے کی وجہ سے تردد ایک قدرتی امر تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی سپہ سالار کو لکھا:۔

"معلوم ہوتا ہے تم بھی رومیوں کی طرح آرام پسند ہو گئے ہو۔ ورنہ اس قدر دیر نہ ہوتی۔"

اس خط نے تازیانے کا کام کیا۔ اور اسلامی لشکر نے اپنے نئے حملے کی ابتدا اس جوش و خروش سے کی کہ رومی فوجیں اس کی تاب نہ لاسکیں اور صلح کی طالب ہوئیں۔ صلح نامہ کی شرائط مسلمانوں کے حق میں طے ہوئیں۔ اور صلح کی میعاد گیارہ ماہ رکھی گئی۔ جو ستمبر ۶۴۲ء میں ختم ہوتا تھی۔ مسلم افواج عہدنامہ کی پابندی کرتے ہوئے گیارہ مہینے تک اسکندریہ کے شہر میں داخل نہ ہوئیں۔ اس شہر پر مکمل قبضہ عہدنامے کی میعاد ختم ہونے کے فوراً بعد کیا گیا۔ اور فتح اسکندریہ کے ساتھ مصر کی فتح تقریباً مکمل ہو گئی۔ ملک کو پورے طور پر تسلط میں لانے کے لئے محدود لیول پہ مقامی قبائل اور رومیوں کے خلاف جنگیں ہوتی رہیں۔ جس کا بنیادی مقصد ہر قسم کی مخالفت کی بیخ کنی اور اسلامی حکومت کو استحکام بخشنا تھا۔ عمرو بن عاص نے تقریباً دو سال سے بھی کم عرصے میں رومیوں جیسی عظیم الشان سلطنت کو مصر میں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور اسلام کا وہ چراغ سرزمین مصر پہ روشن کیا جو چودہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی ویسا ہی روشن ویسا ہی ضیا پاش ہے جیسے پہلے روز تھا۔

فتح مصر کے بعد عمرو بن عاص کی مہم جو طبیعت صرف اسی فتح پر قانع نہیں ہوئی بلکہ وہ اسلام کا پیغام اور آگے پہنچانا چاہتے تھے۔ اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ رومیوں کی قوت کو اس حد تک توڑ دیا جائے۔ کہ ان کو پھر کبھی مسلمانوں سے مصر واپس لینے کا حوصلہ نہ ہو۔ اور دین حق اس سرزمین پہ امن اور سلامتی کی فضا میں فروغ پا سکے۔ اس مقصد کے لئے عمرو بن عاص نے ایک لشکر مغرب کی جانب روانہ کیا۔ جس نے جون ۶۴۳ء میں طرابلس کو گھیرے میں لے لیا۔ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ ایک روز سخت جنگ کے بعد عمرو بن عاص خود ایک دستہ ساتھ لے کر سمندر کی طرف

شہر میں داخل ہو گئے۔ جس طرف فصیل نہ تھی۔

طرابلس پر قبضے کے بعد عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر اجازت چاہی کہ تیونس صرف ۹ منزل کے فاصلے پر ہے اگر خلیفہ وقت اجازت دیں تو وہ بڑھ کر اس کو بھی مملکت اسلامیہ میں شامل کر لیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کی ممانعت کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ جو علاقہ قبضے میں آ چکا ہے اس کا انتظام کر کے اس کی حفاظت کی جائے چونکہ اور جنگوں سے قلیل اسلامی لشکر کے تلف ہو جانے کا امکان موجود تھا اور وہ خود دوسرے علاقوں میں مہمات کی وجہ سے مصر کے لئے مزید کمک مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس موقع پر فتوحات کا دائرہ مزید بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔

مصری باشندے رومیوں کے پنجۂ استبداد سے سات سو سال بعد آزاد ہوئے تھے اور ایک بدترین طویل غلامی کے بعد انہوں نے پہلی بار عدل، آزادی کی فضا میں سانس لیا تھا۔ وہ اسلامی رواداری، مساوات اور شفقت کا برتاؤ دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ لاکھوں قبطی عمرو بن عاصؓ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے۔ والیٔ مصر نے ان کو اس بات کی مکمل آزادی دے دی کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے عقیدے پر کاربند رہیں۔ ان کے جان و مال۔ جائیداد۔ عزت و حرمت۔ دولت و تجارت غرض ہر چیز کی حفاظت کا انہیں یقین دلا دیا گیا۔ انتظامی امور کے لئے چن چن کر قابل اور ایماندار لوگوں کو رکھا گیا۔ اور ہر عقیدے کے لوگوں سے برابر کا سلوک کیا گیا۔ عمرو بن عاصؓ نے رومیوں کے زمانے کے غیر انسانی قوانین کو منسوخ کر کے ایک عادلانہ نظام قائم کیا۔ خراج۔ جزیہ۔ مالیہ وغیرہ کی وصولی خود قبطیوں کے حوالے کی اور امن عامہ اور فلاح و بہبود کے ایسے کام کئے کہ جلد ہی مصریوں کے سب سے بڑے مونس و ہمدرد سمجھے جانے لگے۔ فسطاط کا شہر محاصرہ بابلیون کے دوران آپ کی اس خیمہ بستی کے مقام پر آباد ہوا۔ جہاں آپ سات ماہ تک مقیم رہے تھے۔

عمرو بن عاص کی فتوحات عسکری نقطۂ نظر سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ آپ کے تمام معرکے مسلسل جارحانہ کاروائی کے جیتے جاگتے نمونے اور جرأت و مردانگی کے لازوال نقوش ہیں۔ آپ ایک دور رس فوجی قائد تھے اور اپنے مدمقابل کی نفسیات اور اس کی کمزوریوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اور ان سے بروقت فائدہ اٹھانے کے فن کو جانتے تھے۔ مہمات فلسطین کے دوران آپ نے اندازہ کر لیا تھا کہ رومی باوجود تعداد میں کئی گنا ہونے اور بہتر اسلحے سے لیس ہونے کے پہل کرنے سے کتراتے تھے۔ تساہل پسند تھے اور جارحانہ کاروائی پر دفاعی جنگ کو ترجیح دیتے تھے ہر لشکر اور ہر قلعہ اپنی علیحدہ جنگ لڑنے کا عادی تھا وہ دشمن کی نقل و حرکت سے بے نیاز اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ حوصلہ جلد ہارتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنے اور ایک منضبط جنگی منصوبے کے تحت لڑنے کے اوصاف بھول چکے تھے۔ عوام کے ساتھ ان کا سلوک ظالمانہ تھا اور ان کی ہمدردیاں اپنے آقاؤں کے ساتھ نہ ہونے کے برابر۔

عمرو بن عاص ایک زیرک سپہ سالار کی طرح ان کمزوریوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے مقصد کے حصول سے ان کا بھرپور استعمال کیا۔ فتح مصر قلت تعداد کے باوجود عمرو بن عاصؓ کی انتظامی قابلیت اور جنگی بصیرت ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس مضمون کی ترتیب و تدوین کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ تاریخ اسلام (انگریزی) سید امیر علی
۲۔ تاریخ اسلام (انگریزی) فلپ کے ہٹی
۳۔ فاروق اعظم۔ مولانا شبلی نعمانی
۴۔ عمرو بن عاص۔ اسلم جے راج پوری
۵۔ اسلامی جنگیں۔ کرنل گیلانی

بقیہ از صہ۱ **سرسید**

انگریزوں کا ساتھ انہوں نے وقت کی کسی مجبوری کی بنا پر نہ دیا تھا۔ اس کا تعلق وقت شناسی کے اس جوہر سے تھا جو ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ سرسید نے مغلیہ حکومت کی زوال پذیری، ملک کی عام حالت، مجاہدین آزادی کی تنظیمی تحریک کی لامرکزیت کو محسوس کرکے اور مغلیہ حکومت کے انگریز ٹھیکے داروں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے ... جمعیت اور ان کی منظم اور بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر اس راہ کے جو تقاضے تھے وہ انہوں نے پورے کئے۔ اور رسم وفا کو نباہا۔ اور جب غداران وطن کو ان کی کارگذاریوں کا صلہ دینے کا وقت آیا تو ایک جاں نثار وطن کی جائیداد سرسید کو بھی پیش کی گئی لیکن انہوں نے جاگیر قبول کرنے کی بجائے وظیفہ کی شکل میں اپنی "خدمات" کا صلہ وصول کرنا چاہا۔ یہ سرسید کی بڑی دور اندیشی تھی۔ انگریز کے لئے یہ ایک قابل قبول صورت تھی اس نے قبول کر لی۔ اور سرسید زندگی بھر "حسن خدمات" کے نام پر "غداری وطن" کا صلہ پاتے رہے۔

بقیہ از ص۶۰ **مخزن التفاسیر**

"تو کہہ میں پناہ میں آیا۔ لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود کی بدی سے اس کی جو پھسلاتے چھپ جاتے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں"

مولانا محمد الیاس مفسر زیر نظر تفسیر نے مندرجہ ذیل ترجمہ پیش کیا ہے۔

"وو ایہ پناہ غواړم په پروردګار د خلقو بادشاه د خلقو معبود د خلقو له شره ... وسوسه غورزونکی خناس نه هغه دئ چه وسوسه غورزوی په ښنو د خلقو کښې پیریانو او خلقو نه"

مندرجہ بالا موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد الیاس نے زیادہ تر استفادہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث ... کے فارسی ترجمہ سے کیا ہے۔
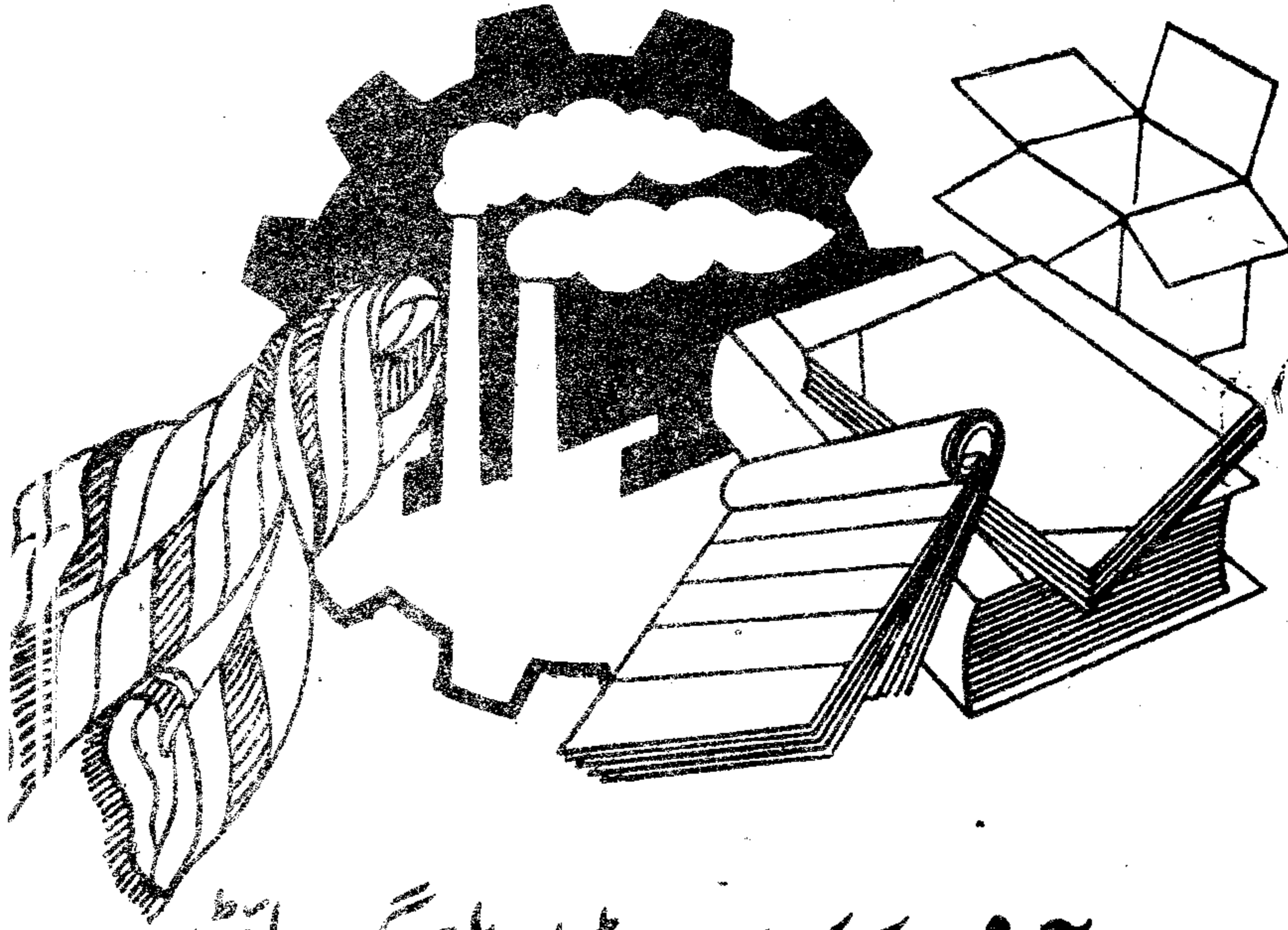
بشیر محمد اختر

کتاب "یہودیت و مسیحیت" پر ایک تحقیقی نظر

مذاہب اہل کتاب کی حقیقت

ادیان عالم کا مطالعہ و تقابل جس قدر دلچسپ اور خیال افروز موضوع ہے اسی قدر اس پر اظہار رائے کرنا اور اس وادی پرخار سے صاف صاف دامن بچا لینا ایک امر محال ہے۔ اس قسم کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر و بیشتر ذاتی جوش و جذبے کی بلند آہنگی معقولیت و صداقت کے دھیمے سُروں پر غالب آتی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً جب دوسرے مذاہب زیر بحث ہوں۔ تو تعصب و عناد کو بالائے طاق رکھ کر حق گوئی کا فریضہ ادا کرنا کار عظیم ہونے کے ساتھ ہمت آزما بھی ہے اور بڑے حوصلے اور جرأت کی بات۔ ایسی بیشتر تحریریں عام طور پر اسی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں اور وزن و وقار اور تاثیر و اعتدال کی ملائمت و معقولیت سے عاری۔

اس میں شک نہیں کہ خالص علمی، معروضی اور سائنسی نظر انداز سے بھی ایسے موضوعات کے مطالعے اور تفہیم کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اور ایسے ہی اسلوب میں انہیں پیش بھی کیا گیا ہے۔ اسی لئے وہ فکر و فہم کی راہ سے دلوں کی گہرائیوں تک اپنا نقش بٹھانے میں کامیاب رہیں۔ اسی طرح ایک سعی بلیغ ڈاکٹر احسان الحق رانا کی تصنیف یہودیت و مسیحیت کی صورت میں کی گئی ہے۔ اس کا ذیلی عنوان ہے:۔

"مذاہب اہل کتاب کی حقیقت" — اور یہ حقیقت اہل کتاب کی اپنی ہی کتابوں کی روشنی میں نہایت دیانتداری اور بے تعصبی کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے پانچ سالہ تحقیقی مطالعے کا حاصل پہلے ایک مسودے کی شکل میں مرتب کیا اور اس کی پچاس نقلیں مسلمان علماء اور مسیحی زعماء کو تبصرے کے لئے روانہ کی تھیں۔ تاکہ کتاب کی اشاعت سے پہلے تبصرے اور تنقید کے مراحل بھی طے ہو جائیں۔ اور ضروری تغیر و تبدل کر دیا جائے۔ خوش بختی سے اس مسودے کی ایک نقل راقم الحروف کو بھی موصول ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا تاثر یہی قائم ہوا تھا کہ سائنسی علوم و حقائق سے وابستہ ایک فاضل کی نگارشات ضرور حق و صداقت اور ٹھوس دلائل و استناد پر مبنی ہوں گی اور ضرور قابل توجہ اور اثر پذیر ٹھہریں گی۔ چنانچہ پورے مسودے اور اب پوری کتاب کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ

اس میں بائبل کے علاوہ خود یہودیوں اور مسیحوں کی مشہور و مستند کتابوں کے حوالوں سے ثبوت پیش کئے گئے ہیں کہیں بھی کوئی خالی خولی دعویٰ یا جذباتی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا اور نہ بغیر دلیل اور حوالے کے بات کی گئی ہے۔

حق و صداقت کی اس آواز کو دبا دینے کی مذموم و ناکام کوشش بھی کی گئی۔ اور کتاب کی اشاعت سے پہلے اسے نہ صرف ضبط کرا دیا گیا بلکہ مصنف پر جھوٹا مقدمہ قائم کر کے اعلیٰ ملازمت سے برطرفی اور جیل بندی کی صعوبتوں میں بھی مبتلا کرا دیا گیا۔ تحقیق احوال کے بعد مصنف پر لگائے گئے سبھی الزامات غلط ثابت ہوئے۔ چنانچہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ اور مسودہ واگذار کر دیا گیا۔ چنانچہ پھر نظر ثانی کے بعد کتاب صدیقی ٹرسٹ کراچی کے تعاون سے مسلم اکادمی لاہور نے نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع کر دی۔

ایسی معرکتہ الآرا کتاب کی اشاعت پر مصنف اور ناشر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب صداقت پسند اور حقیقت جو انسان کے لئے غور و فکر کا ایک وافر سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ اس کی ترتیب میں جس جاں فشانی عرق ریزی اور صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے اس کا اعتراف بہت ضروری ہے۔ انداز و اسلوب شروع سے آخر تک سائنسی اور تجزیاتی ہے۔ اور یہ اس کی اپیل اور تاثیر کی ایک بڑی ضمانت ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مصنف نے اپنی اس تالیف کو کسی قسم کی منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ چنانچہ کوئی رائلٹی وصول نہیں کی اور نہ کوئی ... بلکہ سب کچھ اظہار حق کے لئے کیا۔ اور فی سبیل اللہ۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

کتاب چار سو صفحات اور سترہ ابواب پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہم یہاں اس کتاب کے مندرجات کا بابِ جائزہ لیتے ہیں اور اس کے مباحث کے اہم نکات پیش کرتے ہیں۔

پہلا باب بائبل کی کتابوں کے بارہ میں ہے۔ سات صفحوں کے اس باب میں بائبل کے دونوں حصوں یعنی عہد قدیم اور عہد نامہ جدید میں شامل کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ عہد نامہ میں کتابوں کی تعداد ۴۶ ہے۔ انہیں اور عیسائی کلام الٰہی مانتے ہیں لیکن مسیحوں کی پروٹسٹنٹ جماعت ان میں سے صرف ۳۹ کو صحیح مانتی ہے اور باقی کتابوں پر ایمان نہیں رکھتی۔

عہد نامۂ جدید میں شامل کتابوں کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان میں چار انجیلوں کو شروع میں جگہ دی گئی ہے حالاں کہ انجیلوں سے پہلے سینٹ پال کے خطوط لکھے جا چکے تھے۔ اس سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ چاروں انجیلوں کی بنیاد حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے بجائے پال کے نظریات پر رکھی گئی ہے۔ نئے عہد نامے کو صرف مسیحی الہامی کلام مانتے ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بعض رسولوں پر بعض کتابیں نازل ہوئی تھیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں ملتا ہے۔ پیغمبروں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان پر اتاری گئی کتابوں پر ایمان لانا بھی مسلمانوں کے لئے

ایک ضروری شرط ہے۔ لیکن مسلمان قرآن مجید کے وسیلے اور تحقیق و مطالعے کے ذریعے سے یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اب ان کتابوں میں بہت کچھ ردو بدل ہو چکا ہے اور الہامی کتاب میں انسانی کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ پھر خود ان کتابوں مثلاً توریت، زبور اور انجیل میں کہیں بھی یہ دعویٰ موجود نہیں کہ یہ اپنی اصلی حالت میں محفوظ بھی ہیں جب کہ قرآن مجید نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا تھا کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝

بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے (النساء ۸۲)

بائبل میں اگر طرح طرح کے اختلافات اور تضادات پائے جاتے ہیں تو وہ الہامی ہونے کے اس معیار پر کہاں پوری اتر سکتی ہے؟ اس لئے اسے الہامی اور خدائی کلام نہیں سمجھا جا سکتا۔

دوسرے باب کا عنوان بائبل کی ترتیب و تدوین ہے۔ یہ باب بارہ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں فنک انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور کولرز انسائیکلوپیڈیا سے اقتباسات کی روشنی میں یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ بائبل کے تمام اصل نسخے گم ہو چکے ہیں۔ اور قدیم ترین نسخے جو میسر آئے ہیں۔ ان میں طرح طرح کے اختلافات اور تضادات راہ پا گئے ہیں۔ ان میں کئی الفاظ بدل دئے گئے اور کئی حذف کر دئے گئے ہیں۔ اس طرح متن کی معنوی حیثیت ہی متغیر ہو کر رہ گئی ہے اور خدائی کلام میں انسانی کلام کی شمولیت سے اصل بات کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔

تیسرے باب میں آسمانی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے تیس صفحات ہیں۔ یہ جائزہ جن اہم نکات کی وضاحت کرتا ہے انہیں ہم خلاصۃً یوں سمیٹ سکتے ہیں۔

۱۔ تورات۔ عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں تورات مانی جاتی ہیں۔ تورات کا معنی شریعت کا ہے۔ ان کتابوں میں موسوی شریعت درج ہے۔ یہودی اور عیسائی تورات کو حضرت موسیٰؑ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ خود تورات کے مطالعہ سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

بتایا یوں جاتا ہے کہ اصل تورات کا نسخہ ہیکل میں رکھا رہتا تھا۔ لیکن ہیکل کی بربادی کے ساتھ ہی وہ نسخہ بھی ضائع ہو گیا۔ چنانچہ بابل میں اسیری کے زمانے میں محض یادداشتوں سے تورات دوبارہ مرتب ہوئی اور پھر اس کی تحریف و ترمیم کا سلسلہ شروع ہو گیا اب صورت حال کچھ یوں معلوم ہوتی ہے۔ کہ تورات پانچ کتابوں کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک ہی کتاب ہے جو بائبل کے اندر کتاب استثنا کی صورت میں موجود ہے۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کی زبانی لکھا گیا بیشتر کلام الہامی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اصل تورات ہے۔ باقی کا کلام

جو نہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان تھی نہ ان کے حواریوں کی۔

ڈاکٹر احسان الحق رانا اپنے ایک اور مقالے میں "بائبل سے بائبل کی تکذیب" میں بھی بتاتے ہیں کہ عہد نامہ جدید کی تدوین و ترتیب سے عیاں ہے کہ مسیحیت کی بنیاد کتب عہد نامہ جدید پر نہیں رکھی گئی بلکہ عہد نامہ جدید مسیحیت کی پیداوار ہے۔ حضرت مسیح اور ان کے پیروکار سبھی یہودیوں کی مادری زبان آرامی تھی۔ یسوع مسیح کے انتخاب کردہ سبھی حواری ان پڑھ تھے۔ یونانی تو کیا وہ آرامی میں بھی کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ عہد جدید کی ساری کتابوں کا یونانی زبان میں لکھا جانا اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ انہیں لکھنے میں فلسطینیوں اور حضرت مسیح کے حقیقی شاگردوں کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔[۵]

چھٹا باب۔ "تاریخ بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ سے حضرت سلیمانؑ تک" ۲۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس باب میں بائبل کی رو سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا بیان اور بنی اسرائیل کی مردم شماری کا خلاصہ دیا گیا ہے، پھر برٹانیکا کے حوالوں سے ان کے تضادات واضح کئے گئے ہیں۔ اور مبالغوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے والد عمران کی شادی اور کنعان میں یشوع کی فتوحات کے بیانوں کے اختلافات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

ساتواں باب بائبل میں مذکورہ نسب ناموں اور گوشواروں کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ یہ باب سو صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کے مطالعے سے جو نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے یہی ہے کہ ان نسب ناموں میں مندرج اسمار، سن و سال، عہد و زمانے کو تاریخی حیثیت سے نہیں جانچنا چاہیئے۔ کیونکہ بقول برٹانیکا موجود حالت میں بیان کردہ واقعات میں تاریخی اعتبار سے بہت سے اغلاط و تضادات موجود ہیں۔ اور اس سلسلے میں نامور علماء کے مابین اہم مسائل پر بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال واضح ہو:۔

شاہ یہوداہ یہورام بن یہوسفط ۴۰ برس کی عمر میں فوت ہوا۔ (۲۔ تواریخ۔ ۲۱: ۲۰) اس کے بعد اس کا سب سے چھوٹا بیٹا اخزیاہ تخت نشین ہوا اور اس وقت اس کی عمر ۴۲ برس کی تھی (۲۔ تواریخ ۲۲: ۲) گویا سب سے چھوٹا بیٹا اپنے باپ سے بھی دو سال بڑا تھا۔

آٹھویں اور نویں باب میں بھی بائبل کے بیانات کے تاریخی مغالطوں اور تضادوں کا مذکور ہے۔ دو باب ص ۱۵۲ سے ص ۲۰۰ تک پہنچتے ہیں۔ بیانات تو بنیادی طور پر بائبل کے ہیں اور ان پر تبصرے کہ

---

[۵] "بائبل سے بائبل کی تکذیب"۔ ڈاکٹر احسان الحق رانا، ادارہ تحقیق مذاہب، گلبرگ لاہور ص۱۳ جنوری ۸۲ء

یہ بیان بھی درست نہیں کہ سورج اور چاند اکٹھے بنے تھے[1]

بائبل کے بیانات کی رو سے اولین انسان یعنی حضرت آدمؑ کی پیدائش قریباً چھ ہزار برس پیشتر ہوئی تھی۔ لیکن جدید سائنس دان زیادہ تر یہودی اور عیسائی ہیں۔ ایسے بیانات کی تکذیب کر رہے ہیں مثلاً جدید تحقیقات کے مطابق فلسطین میں انسانوں کے بسنے کے آثار کم از کم دو لاکھ سال پرانی پتھر کی تہذیب سے مل ملتے ہیں۔ اسی طرح کلولینڈ امریکہ کے ایک ماہر علم الانسان ڈاکٹر جانسن نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس نے تیس چالیس لاکھ سال پیشتر کے آدمی کی ایک نئی نوع دریافت کرلی ہے۔ جس سے ڈارون کا نظریہ باطل ہو کر رہ گیا ہے۔

اس طرح بائبل میں مندرج قصے اکثر و بیشتر غیر فطری اور غیر سائنسی ٹھہرتے ہیں۔ مثلاً یشوع کا بیان ہے ۔ اے سورج! تو جبعون پر اور اے چاند! تو وادی ایالون میں ٹھہرا رہ۔ سورج ٹھہر گیا اور چاند تھما رہا جب تک قوم نے دشمنوں سے اپنا انتقام نہ لیا۔

گویا سورج اور چاند دونوں ایک ہی وقت میں جلوہ فگن ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جانے کی ہدایت ہو رہی ہے۔ پھر آگے ان دونوں کے تھم جانے کا بیان ہے۔ حالاں کہ یہ امر غیر فطری ہے۔ اگر اجرام فلکی میں سے کوئی ایک بھی لمحے بھر کے لئے ساکن ہو جائے تو قیامت برپا ہو جاتے۔

بادشاہ ابی ملک اور حضرت سارہ کا واقعہ بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت سارہؑ سے حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت ملنے کے بعد بیان ہوا ہے اس وقت حضرت سارہ نوے برس کی بوڑھی اور بانجھ تھیں۔ ان کا احوال اور سن و سال ہرگز ایسا نہ تھا

---

[1] یہاں فرانس کے سرجن اور سکالر ڈاکٹر موریس بوکائے کی کتاب " بائبل، قرآن اور سائنس " کا حوالہ بے موقع نہ ہوگا۔ انہوں نے اس کتاب میں بے شمار حوالوں اور مثالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ عہد نامہ قدیم کی کتاب پیدائش میں دنیا کی تخلیق اور زمین پر انسان کے ظہور اور انساب سے متعلق جو اعداد و شمار دیے ہیں۔ وہ جدید سائنسی معلومات کے مسلمہ حقائق سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لئے انہیں تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید سائنس انکشافات اور علوم بائبل کے بیانات کی تصدیق و توثیق نہیں کرتے۔

تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر بوکائے کی کتاب یا راقم کا مضمون " ایک فرانسیسی سائنسدان کی مفکرانہ تصنیف، بائبل، قرآن اور سائنس " مطبوعہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۸۲ء

مثلاً حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد کے حالات تورات کا حصہ نہیں اور یہ محرف کلام ہے یا الحاقی۔

۲۔ زبور۔ قرآن مجید کی رو سے زبور حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی۔ لیکن بائبل میں شامل زبور کے متعلق عیسائیوں کی روایت یہ ہے کہ یہ ان پانچ دیوانوں کا مجموعہ ہے جن میں ہر طرح کے مذہبی گیت درج ہیں ان مزامیر کا شمار عموماً ایک سو پچاس دیا جاتا ہے ان کی تعداد اور ان کے مصنفین کے بارے میں کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ گمان یہی گذرتا ہے کہ ان میں سے اکثر مزامیر مختلف لوگوں کے ہیں۔ اور حضرت داؤد کے بہت بعد کی تصنیف ہیں۔

۳۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ اناجیل اربعہ ۶۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان یعنی حضرت عیسیٰؑ کے رفع سماوی کے بعد بہت لکھی گئیں جب کہ اصل انجیل موجود نہ تھی۔ پھر یہ اناجیل نہ آرامی زبان میں تھیں اور نہ عبرانی زبان میں، بلکہ یونانی میں، جو نہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان تھی اور نہ ان کی قوم کی۔ چنانچہ ان کی حیثیت حضرت عیسیٰ کے کلام کی عدم موجودگی میں زیادہ سے زیادہ تراجم کی ہو سکتی ہے لیکن اس قسم کے تراجم کی صحت پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس صورت میں موجودہ اناجیل قابل اعتماد نہیں ٹھہرتیں۔

۴۔ محفوظ اور مستند کلام الٰہی ہونے کا شرف وحید صرف قرآن مجید کو حاصل ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ دنیا کی بالکل بے نظیر کتاب ہے۔ آیات قرآنی کو نزول کے بعد ایک طرف تو لکھ کر محفوظ بنا دیا جاتا تھا تو دوسری طرف حفظ کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا اصل متن روز اول سے آج تک نہ صرف اوراق کے سفینوں میں مرقوم ہے بلکہ حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ ہے۔ اس کے ترجمے دنیا کی کم و بیش تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ لیکن ترجمے کے ساتھ اصل متن من وعن موجود ہوتا ہے تاکہ کسی قسم کی تبدیلی یا تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور اگر کہیں قاری کو اشتباہ ہو جائے تو وہ اصل سے اپنی تسلی کر لے۔ پھر چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور اس کا آخری پیغام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اٹھائی ہے اس طرح قرآن مجید آسمانی کتابوں میں ممتاز و منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

چوتھا باب کتب عہدِ عتیق کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اور چوبیس صفحوں کو محیط ہے۔ اس میں فاضل مولف ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک طرف تو بائبل کی کتابوں کو الہامی قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان کتابوں کے مصنفین کے نام بھی دیئے جاتے ہیں۔

کتاب پیدائش کے ابتدائی ابواب کے اقتباسات دے کر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان میں درج بیانات خود یہودی اور عیسائی سائنس دانوں کے نزدیک قوانین فطرت کے خلاف ٹھہرتے ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ پہلے دن خدا نے زمین اور آسمان پیدا کئے حالاں کہ زمین اور آسمان ایک وقت میں نہیں بنے۔

بڑے تھے کہ گٹھا نہیں اٹھا سکتے تھے۔

قرآن مجید کے بیان کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کے کوئی اولاد نہ تھی تو انہوں نے اس کے لئے دعا مانگی۔ ...ر تعالیٰ نے ان کو نرم دل پہلوٹھا بیٹا (حضرت اسماعیلؑ) عطا کیا۔ اور انہوں نے حکم الٰہی کے مطابق حضرت ...اعیلؑ کو ہی قربانی کے لئے پیش کیا۔ قربانی کے واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود حضرت اسحاقؑ کی بشارت ...ی۔ تفصیلات کے لئے سورۃ الصٰفٰت کی آیات ۹۹ تا ۱۱۳ ملاحظہ فرمائیے[1]۔

پانچواں باب "مسیحی اور یہودی اقوام" ہے اور سولہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل ...نکات واضح کئے گئے ہیں۔

۱۔ حضرت عیسیٰؑ کو ابن داؤد کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عہد نامہ قدیم کی ...ابیں کئی جگہ یہ خبر دیتی ہیں کہ یہودیوں کو غلامی سے نجات دلانے والا حضرت داؤد کی نسل سے ہوگا۔ اس ...حضرت عیسیٰؑ سے یہ امید وابستہ کرکے انہیں ابن داؤدؑ کہا جانے لگا۔

۲۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آپ کو کہیں بھی ابن داؤد یا ابن اللہ نہیں کہا۔ صرف ابن آدم اور نبی کے طور ...ش کیا ہے۔ لیکن اناجیل میں انہیں بارہا ابن داؤد اور ابن اللہ لکھا گیا ہے۔

۳۔ وہ صرف بنی اسرائیل کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ خود ان کا فرمانا ہے کہ "میں بنی اسرائیل کے ...ا‌رانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" اس لئے انہیں اقوام عالم کا منجی ...ا قطعاً درست نہیں۔

۴۔ حضرت عیسیٰؑ کا پیغام اپنی اصل شکل و صورت میں ہم تک نہیں پہنچا۔ پھر اس میں تحریف و تغیر کا عمل ...ی رہا اور سینٹ پال نے کئی احکام منسوخ کر دیے بلکہ کئی نئے عقائد دین میں شامل کر دیے۔

۵۔ اناجیل اربعہ کی ترتیب سے قبل سینٹ پال نے اپنے چودہ مکتوب تحریر کئے تھے جو عہد نامہ جدید ...کا اہم حصہ شمار ہوتے ہیں۔ پال ہی کے نظریات کی بنیاد پر اناجیل مرتب ہوئیں اور وہ بھی ایک ایسی زبان میں

---

[1] "تطہیر بائبل" کے مصنف نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اسماعیلؑ کے ختنے کے وقت اس کی عمر تیرہ سال ...ی اور اس کے بعد اسحاقؑ کی بشارت ہوتی ہے اور ایک سال بعد اسحاق پیدا ہوتا ہے گویا کہ بائبل کے مطابق ہاجرہؑ اور ...اسماعیلؑ کی ہجرت کے وقت اسماعیل کی عمر تقریباً ۱۵ یا ۱۶ کی تھی انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیں انہیں مواخذ سے اتفاق ...کرنا پڑے گا جو اسلامی روایات اور تحقیقات سے ہم تک پہنچے ہیں۔ مزید لکھا ہے کہ اگر ہم مسئلہ ذبیحہ کا بلا تعصب فیصلہ ...کریں تو اس عظیم قربانی کا حقدار صرف اسماعیلؑ ہے کیونکہ وہ ابراہام کا پہلا پھل ہے۔ ("تطہیر بائبل" ص ۶۴ تا ۷۰)

کہ بادشاہ وقت ملاقات کا مشتاق ہوتا۔ اسی طرح کتاب پیدائش ہی میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے تو یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ ایک بزدل اور بے حس انسان تھے۔ حالاں کہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

کتاب پیدائش ہی میں حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیوں کا قصہ بیان ہوا ہے یہ سراسر الزام تراشی ہے پھر اس میں ایک صریح غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے کہ اس وقت زمین پر کوئی مرد موجود نہ تھا جوان لڑکیوں سے شادی کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت حضرت لوطؑ کے چچا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم موجود تھی اور حضرت لوطؑ کی بالغ لڑکیاں اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہو سکتی تھیں[1]۔ اسی طرح اور نبیوں اور ان کی اولاد پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔

اسی باب میں چند اور قصوں کے تضادات بھی واضح کئے گئے ہیں۔ جیسے حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں کتاب پیدائش کے مطالعے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت چودہ برس کے تھے۔ لیکن اسی کتاب کے باب ۲۱ ہی میں حضرت اسماعیلؑ کی علیحدگی کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا کہ گویا حضرت اسحاقؑ کا دودھ چھڑاتے وقت ننھے بچے تھے۔ پھر جب اکلوتے بیٹے کی قربانی کا سوال سامنے آتا ہے تو حضرت اسحاقؑ کا نام لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ کسی طور بھی اکلوتے نہیں ٹھہرتے۔ بائبل کی رو سے جس بیٹے کی قربانی پیش کی گئی وہ سوختنی لکڑیوں کا گٹھا اٹھانے کے قابل تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت اس قدر چھوٹے

---

[1] اعجاز چوہدری نے اپنی کتاب "تطہیر بائبل" میں اس واقعے کی جزئیات کا جائزہ لے کر اسے مسترد کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ لڑکیوں کا اپنے باپ سے ہم آغوش ہونا اور اس کو اس بات کا علم نہ ہونا۔ جنسی کارکردگی کی تھیوری کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ نشے کی حالت اگر بے ہوشی تک پہنچ گئی ہو تو اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں اور انسان یہ فعل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ بے ہوش نہیں، صرف نشے کی حالت میں ہے تو اس کو مفعول کی پوری پوری پہچان ہوگی۔ ہمارے مشاہدے میں بلانوش قسم کے لوگ آتے ہیں لیکن گھر پر وہ ماں بہن اور بیوی میں تمیز کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس داستان سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسرائیلی کا ہنوں نے موآبی اور عمونی نسلوں کو ذلیل کرنے کے لئے بطور سند اس مجموعے میں داخل کر دی ہے۔ دیکھئے" تطہیر بائبل" فیتھ پبلشرز لاہور۔ جلد اول ص ۴۷۔ (مذکورہ کتاب کے مصنف اعجاز چوہدری ایک مسیحی مبلغ تھے اپنی کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور دینی خدمات میں مصروف ہیں۔

سی انسائیکلوپیڈیا سے پیش کئے گئے ہیں ۔
دسواں اور گیارہواں باب (صفحہ ۱۰۲ تا ۲۰۳ تک) حضرت عیسیٰ کے حسب ونسب، پیدائش اور حالات زندگی سے متعلق ہیں۔ ان ابواب کے چند اہم نکات ملاحظہ ہوں۔
۱۔ بائبل میں روایت کردہ حضرت عیسیٰ کے نسب نامے باہم مختلف ہیں ۔
۲۔ انہیں حضرت داؤد کی اولاد ظاہر کیا گیا ہے ۔ حالاں کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریمؑ آل عمران سے تھیں ۔
۳۔ حضرت عیسیٰ کے عام حالات نہیں ملتے کیونکہ برٹانیکا کے بموجب ان کے اپنے زمانے کا لکھا ہوا کوئی بھی ماخذ نہیں جس سے ان کی زندگی کے حالات قلم بند کئے گئے ہوں ۔ ان کی تاریخی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کا ماخذ بلا استثنا یسوع کے بعد وضع کردہ نظریات اور خاص طور پر وہ قدیم مواد ہے جسے پہلی تین انجیلوں میں اکٹھا کیا گیا ہے ۔ عہد جدید کی شہادتیں اس قدر متضاد ہیں کہ ان میں سے اکثر سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکتا ۔
۴۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں اناجیل میں متضاد بیانات موجود ہیں ان سے کئی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں ۔
بارہواں باب چوبیس صفحوں پر مشتمل ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں اور حواریوں کے بارے میں ہے ۔ اس میں درج ذیل نکات پر مدلل بحث کی گئی ہے ۔
۱۔ اناجیل کے بیانوں سے حضرت عیسیٰ کے بارہ شاگردوں اور حواریوں کی حقیقت اور ان کے ناموں کے بارے میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔
۲۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد سینٹ پال نے آں کران کی تعلیمات کے برعکس اپنی قیادت قائم کرکے ایک نئے دین کو رواج دیا۔ چنانچہ بعد کی صدیوں میں کلیسا نے حضرت عیسیٰ کی بجائے پال ہی کو مسیحیت کا مستند نمائندہ اور خائد قرار دینا شروع کردیا۔
تیرھویں باب (ص ۲۵۵ تا ۲۸۸) "مصلوبیت مسیح" کے عنوان سے یہ حقیقت واضح کردی گئی ہے کہ یہ معاملہ مشتبہ ٹھہرتا ہے ۔ چاروں انجیلوں میں اس ضمن میں پیش کیے گئے واقعات باہم متضاد ہیں البتہ انجیل بارناباس میں جو تفصیلات درج ہیں وہ قرآنی موقف کی تصدیق کرتی ہیں۔[۵]

۵۔ یعنی یہ کہ حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی مشابہت (باقی اگلے صفحہ پر)

چودھویں باب (ص ۲۸۹ تا ۳۱۴) کا عنوان ہے۔ "ابن اللہ اور عقیدہ تثلیث" حضرت عیسیٰؑ نے ا
بیانوں اور وعظوں میں خود کو کہیں بھی ابن اللہ کہہ کر پیش نہیں کیا بلکہ بار بار انہوں نے خود کو ابن آد
(اناجیل میں کم از کم ستر مقامات پر) عہد نامہ قدیم میں جہاں کہیں خدا کا بیٹا یا خدا کا پہلوٹھا کے الفاظ استع
ہوئے ہیں۔ کسی برگزیدہ بندے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان کا خدا کی اپنی زبانی قرار دیا جانا لکھا۔
جب کہ انجیلوں میں یہ سب الفاظ مصنفین کے اپنے ہیں اور کسی ایک جگہ بھی خدا کی زبانی نہیں۔

تثلیث کا عقیدہ مسیحیت کا ایک بنیادی عقیدہ بن چکا ہے۔ لیکن اپنی پیچیدگی کے سبب کبھی کس
کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰؑ سمیت تمام انبیاء ہمیشہ توحید کے عقیدے کی تبلیغ کرتے رہے اور ا
پر سختی سے کاربند رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جب غیر اقوام دائرہ مسیحیت میں آئیں تو انہیں اپنے پرا
عقیدوں کے مطابق مطمئن کرنے کے لئے تثلیث کا نظریہ وضع کر لیا گیا۔

اسی طرح کفارہ کا عقیدہ ہے۔ اسے پندرھویں باب (ص ۳۱۵ تا ۳۲۶) کا موضوع بنا کر یہ بات پا
ثبوت کو بہم پہنچا دی گئی ہے کہ یہ ایک بے بنیاد اور غیر فطری عقیدہ ٹھہرتا ہے۔ منصف مزاج اور روشن
خیال مسیحیوں نے بھی اس عقیدے کو ناقابل فہم اور غیر معقول قرار دیا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان ا
سے ان کی "صلیبی موت" کفارہ بن کر انسان کو اس کے پیدائشی گناہ سے پاک کر دیتی ہے اور بندے
خدا کے باہمی قرب اور ملاپ کا باعث بنتی ہے۔

سولھویں باب کے ۲۳ صفحات ہیں۔ ان میں عہد نامہ جدید کے باہمی اکیس تضادات بطور مثال پیش
کئے گئے ہیں۔ اسی طرح قدیم و جدید عہد ناموں میں لفظی و معنوی تحریفات کی چالیس مثالیں درج کی
ہیں۔ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں عہد نامہ جدید میں عہد نامہ قدیم کا باقاعدہ حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن لفظی
معنوی تحریفات سے گریز نہیں کیا گیا۔

سترھویں باب میں (۳۲۷ تا ۳۸۰) مسودۂ کتاب پر مسیحی علماء کے تبصرے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ
تبصرے بالعموم سطحی اور جذباتی قسم کی رائے زنی پر مشتمل ہیں۔ ان میں کچھ اعتراضات بھی کئے گئے ہیں
(باقی ص ۵۲)

بقیہ ص ۴۳ ہو جانے سے پکڑا گیا تھا اور اسے صلیب پر چڑھا یا گیا تھا۔ پھر یہ سارا معاملہ لوگوں کی نظر
میں مشتبہ ہو گیا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف "انجیل بارنا باس کا مطالعہ" اردو ایڈیشن ۷۴ء
انگریزی ایڈیشن ۷۶ء۔ یاد رہے کہ جن انجیلوں کو کلیسا نے ضبط کیا اور چھپائے جانے کا اہتمام کیا ان میں سے
بارناباس کی واحد انجیل ہے جو پھر دنیا میں جلوہ گر ہو چکی ہے اور صداقت کا اعلان کر چکی ہے۔

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب ۔ لاہور

معدن المعانی کی تاریخی اور دینی اہمیت

مخدوم شرف الدین بن شیخ یحییٰ منیریؒ کا شمار ان مشاہیر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنہوں نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت میں اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔

مخدوم صاحب کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے متعدد مجموعے مرتب کئے ہیں ۔ اس وقت ان کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی مرتبہ زین بدر عربی میرے پیش نظر ہے یہ کتاب مطبع اشرف الاخبار بہار شریف میں ۱۸۸۴ء میں چھپی تھی لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے کمیاب ہو گئے ہیں ۔

گذشتہ سال بھارت کے سفر میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں اس دُرِ نایاب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ۔ اب میں اس کتاب کا حاصل مطالعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ۔

صاحب ملفوظات ۔ صاحب ملفوظات کا اصل نام احمد تھا لیکن علمی و دینی حلقوں میں ان کی شہرت اپنے لقب مخدوم شرف الدین سے ہے ۔ ان کے والد بزرگوار شیخ یحییٰ منیر کے رہنے والے تھے ۔

مخدوم صاحب کا شجرۂ نسب آنحضرتؐ کے تایا اور کفیل زبیر بن عبد المطلب سے جا ملتا ہے[۱] ۔ ان کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہہ الخلیل[۲] (فلسطین) سے ترک سکونت کر منیر آ بسے ۔ ان کی سعی و کاوش سے اس علاقے

۱؎ ابو الحسن علی ندوی ۔ تاریخ دعوت و عزیمت مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۳ ص ۱۷۳

۲؎ الخلیل کو حبرون بھی کہتے ہیں ۔ پہلے یہ اردن میں تھا ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ الخلیل میں حضرت ابراہیمؑ ، حضرت اسحٰقؑ ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے مزارات ہیں ۔

میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا محمد تاج فقیہ اپنے اہل خانہ کو منیر چھوڑ کر اپنے آبائی وطن کی طرف لوٹ گئے۔

مخدوم صاحب کے نانا حضرت شہاب الدین جگجوتؒ کاشغر کی سکونت ترک کرکے بہار چلے آئے اور پٹنہ کے قریب جھٹلی میں مقیم ہوگئے۔ ان کے دو نواسوں، مخدوم شرف الدین اور شیخ احمد چرم پوش نے دینی اور روحانی حلقوں میں بڑا نام پایا ہے۔

مخدوم شرف الدین ۶۶۰ھ ۱۲۶۳ء میں شعبان کے آخری جمعہ منیر میں پیدا ہوئے۔[۱] ان کی ابتدائی تعلیم منیر میں ہوئی۔ اور یہیں انہوں نے متوسطات تک نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔

ایک بار برعظیم پاک وہند کے نامور عالم شرف الدین ابو توامہ دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے منیر سے گذرے۔ مخدوم صاحب ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے والد سے اجازت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ان کے ساتھ سنار گاؤں چلے گئے۔[۲]

مولانا شرف الدین ابو توامہ کی نگرانی میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ استاد نے ان کی استعداد اور خاندانی شرافت دیکھ کر اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا۔ سنار گاؤں میں قیام کے دوران میں ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذکی الدین تجویز ہوا۔

مخدوم صاحب اپنے والد کی علالت کے پیش نظر منیر واپس آئے اور ۱۱ر شعبان ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء کو شیخ یحییٰ فوت ہوگئے۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد انہوں نے اپنا بیٹا اپنی والدہ ماجدہ کے حوالے کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اسے ان کا بدل سمجھیں اور یہ سمجھ لیں کہ شرف الدین فوت ہوگیا ہے۔

والدہ سے اجازت اور دعائیں لے کر مخدوم صاحب دہلی روانہ ہوگئے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا اور پانی پت میں شرف الدین بو علی قلندر سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن وہ جیسا مرشد چاہتے تھے، ویسا نہ ملا۔ ایک دن مخدوم صاحب اپنے بھائی کے اصرار پر حضرت نجیب الدین فردوسی کی زیارت کو گئے۔[۳] ان کی قیام گاہ کے قریب جاتے ہی ان کے پسینے چھوٹ گئے۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ انہیں جس مرشد کی مدت سے تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔

مخدوم صاحب نے حضرت نجیب الدین فردوسی کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور مرشد نے انہیں

---

[۱] شیخ محمد اکرم نے آب کوثر میں ان کی تاریخ ولادت ۵ر جولائی ۱۲۶۳ء لکھی ہے۔ [۲] شیخ محمد اکرم، آب کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۴۹۹ [۳] حضرت نجیب الدین فردوسی مہرولی میں فردوسیہ پہاڑی پر دفن ہیں۔

اجازت نامہ دے کر بہار کی طرف رخصت کیا۔ حضرت نے چلتے وقت انہیں وصیت کی کہ اگر وہ راستے میں کوئی
خبر سنیں تو واپس نہ لوٹیں۔ مخدوم صاحب ابھی دو منزل ہی گئے تھے کہ انہیں اپنے شیخ کی وفات کی اطلاع ملی
انہوں نے حسب الحکم اپنا سفر جاری رکھا۔

مخدوم صاحب جب بہیا[1] (ضلع آگرہ) کے جنگل سے گذر رہے تھے تو ایک مور کی آواز سن کر ان پر ایسی
کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے اپنا اجازت نامہ اور سامان اپنے بھائی کے سپرد کیا اور خود جنگل میں غائب
ہو گئے۔

مخدوم صاحب نے بارہ سال بہیا اور راجگیر کے جنگلوں میں جنگلی پھل اور پتے کھا کر گذارے۔ ایک بار
چند لوگوں نے راجگیر کے جنگل میں ان کے مسکن کا کھوج لگا لیا اور وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے
لگے۔ ان دنوں جنگل کا راستہ پُر خطر تھا اس لئے مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ان کے پاس آنے کا خطرہ
مول نہ لیا کریں وہ خود جمعہ کے روز شہر آجایا کریں گے[2]

مخدوم صاحب ہر جمعہ کو راجگیر جانے لگے۔ ان کے معتقدین نے ان کے آرام کے لئے ایک جگہ چھپر ڈال دیا۔
موصوف نماز جمعہ سے فراغت کے بعد وہاں دو تین دن کے لئے رک بھی جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے خانقاہ
بنائی۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں نے انہیں زبردستی مسند پر بٹھا دیا[3] یہ ۷۲۴ھ ۱۳۲۴ء کا
واقعہ ہے۔

خانقاہ میں قیام کے بعد انہوں نے عوام کی رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور چھپن برس تک یہ
سلسلہ جاری رہا۔ مخدوم صاحب ۶ رشوال ۷۸۲ھ ۵ جنوری ۱۳۸۱ء کو بعمر ۱۰۴ سال فوت ہوئے۔ اگلے روز مخدوم
شرف جہانگیر سمنانیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

مخدوم صاحب کے مریدوں اور خلفاء کی تعداد کافی ہے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے
مختلف عنوانات کے تحت مرتب کئے ہیں جن سے اس دور کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، خانقاہی
زندگی اور عوام کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

زیر نظر مجموعہ ملفوظات، جو معدن المعانی کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت کے ایک مرید زین بدر عربی نے
مرتب کیا ہے۔ فاضل مرتب یمن کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی زندگی اپنے شیخ کے آستانے پر ہی گذری ہے

---

[1] بہیا (BIHIYA) آرہ سے مغل سرائے کی طرف جاتے ہوئے آرہ سے اکیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ای۔ آئی۔ ریلوے
کا اسٹیشن ہے [2] ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت ج ۳ ص ۱۹۹ [3] ایضاً

ما نقدِ عمر صرف رہ یار کردہ ایم کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

معدن المعانی کے علاوہ زین بدرعربی نے خوانِ پرنعمت کے عنوان سے بھی مخدوم صاحب کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ مرتب کیا ہے اسی طرح انہوں نے اپنے مرشد کے مکاتیب بھی جمع کئے ہیں۔

مخدوم صاحب اپنے وقت کے مجدد تھے۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی نے ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تمام کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستانی باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا۔ معرفت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت واہمیت دلنشین کی۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشق الٰہی اور خدا طلبی کی حرارت پیدا کردی اور سلوک ومعرفت کے اسرار ونکات اور لطیف و بلند علوم کا اظہار فرمایا بلکہ بعض دوسرے مصلحین امت اور محققین کی طرح ان کا یہ بھی عظیم و روشن کارنامہ ہے۔ کہ انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین وایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت وزندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو بداعتقاد صوفیوں۔ جاہل مشائخ اور فلسفہ وباطنیت سے متاثر اشراقیین کی دعوت سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں جہاں اسلام بہت چکر کاٹ کر پہنچا تھا اور جہاں کتاب وسنت سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے وسائل شروع سے کمزور اور محدود رہے سحر کا اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقائد وخیالات پر ضرب کاری لگائی۔ جس کے پردہ میں یہاں الحاد وزندقہ پھیل رہا تھا۔ اور اسلامی عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور اسلام کے عقائد صحیحہ اور اہل سنت کے مسلک کی نہایت مؤثر وطاقت ور وکالت اور تبلیغ کی[1]

صدیق اکبرؓ کا خواب | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ شام گئے ہوئے تھے وہاں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند اتر کر ان کی گود میں آپڑا ہے۔ انہوں نے کسی معبر سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ نبی آخر الزماںؐ مبعوث ہو چکے ہیں اور ان پر سب سے پہلے موصوف ایمان لائیں گے[2]

وعدہ خداوندی ہنوز ایفا نہیں ہوا | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے آں حضرتؐ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ مشرق سے مغرب تک تمام عالم میں اسلام پھیل جائے گا۔ یہ وعدہ ہنوز پورا نہیں ہوا[3]

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی۔ تاریخ دعوت وعزیمت مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۳ ص ۲۹۸ [2] زین بدر عربی۔ معدن المعانی مطبوعہ بہار شریف ۱۸۸۴ء ص ۱۳ [3] ایضاً ص ۱۵

علماء سُوء کی صحیح تعریف | مخدوم صاحب نے ایک مجلس میں علماء سوء کے بارے میں فرمایا:-

علماء سُوء ایشاں را گویند کہ روئے ایشاں ... ب دنیا باشد و پشت بجانب عقبیٰ۔ یعنی از ... علم ایشاں را مراد محض دنیا بود نہ آخرت[1]	علماء سُوء انہیں کہتے ہیں جن کا رخ دنیا کی طرف ہو اور پشت آخرت کی جانب، وہ تحصیل علم صرف دنیا کے لئے کرتے ہیں آخرت کے لئے نہیں۔

حق تلاوت | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ حق تلاوت سے یہ مراد ہے:

در خواندن قرآن زبان و دل شریک باشند ... زبان درست کردن حروف است و نصیب عقل ... معانی و تفسیر قرآن است و نصیب دل پند ... بدانست و اجتناب نمودن از نواہی و فرمان ... کردن بامرہائی آں۔ حق تلاوت ایں بود[2]	قرآن پڑھنے میں زبان اور دل دونوں شامل ہوں۔ زبان کا کام حروف کی صحیح ادائیگی اور عقل کا کام مطلب سمجھنا اور تفسیر کرنا ہے۔ دل کا کام اسے نصیحت پکڑنا، برے کاموں سے بچنا اور تعمیل احکام ہے۔ حق تلاوت اسے ہی کہتے ہیں۔

قاری زین الدین | سلطان شمس الدین حاکم بنگالہ مولانا زین الدین کی قرائت کا بڑا معتقد تھا۔ یوں تو ... کئی امام تھے اور وہ جہاں ہوتا وہیں کا امام نماز پڑھاتا۔ لیکن اگر وہاں زین الدین موجود ہوتے تو ان کی ... موجودگی میں کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ امامت کراتا۔[3]

اصول اجتہاد | مخدوم صاحب اپنے ساتھیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس ... قرآن میں تلاش کریں۔ اگر قرآن میں اس کا حل نہ ملے تو پھر سنت کی طرف رجوع کریں اور اگر وہاں بھی ... نظر نہ ملے تو پھر اجماع پر نظر ڈالیں اگر اجماع میں بھی اس مسئلہ کا حل نظر نہ آئے تو پھر اجتہاد کریں۔[4]

مرید کے لئے ہدایات | مرید کے قلب پر اگر کوئی واردات گذرے تو وہ سب سے پہلے اپنے پیر سے ... کا ذکر کرے۔ اگر پیر موجود نہ ہو تو جو شخص اس کی جگہ سجادہ پر بیٹھا ہو اور ان امور سے واقفیت رکھتا ... اس سے ذکر کرے۔ اسے چاہئے کہ کسی اجنبی سے اپنی واردات قلبی بیان نہ کرے اور قرآن کی طرف رجوع ... وہاں سے پتہ چل جائے گا کہ اس کا کشف رحمانی ہے یا شیطانی۔ اگر قرآن سے پتہ نہ چلے تو پھر سنت ... رجوع کرے۔ کہ یہی معیار حق ہے۔[5]

تدوین قرآن | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کی تدوین اس ترتیب کے ساتھ ہے جس ترتیب سے ... لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔ اس کی ترتیب نزول کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ جیسا موقع ہوتا تھا ویسی ہی

---

[1] بحر عرفی معدن المعانی مطبوعہ بہار شریف ۱۸۸۴ء ص ۲۷۹ [2] ایضاً ص ۲۳۴ [3] ایضاً ص ۲۴۴ [4] ایضاً ص ۲۴۶ [5] ایضاً ص ۲۴۵

آیات نازل ہو جاتی تھیں[1]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ہی قرآن کی ترتیب درست ہو گئی تھی[2]

حضرت اپنے احباب کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ قرآن حکیم کے بوسیدہ اوراق دفن کر دینے چاہئیں۔

صحابہ کرام | مخدوم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ صحابہ کرام پہ زبان درازکرنی روا نہیں ہے۔ اسی طرح ا
یا بدعت کو ان کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ علم وفضل، زہد وورع، توکل اور ہر لحاظ سے تمام مسلمانوں
افضل ہیں۔ ان میں یہ صفات نبی کریمؐ کی نظر سے پیدا ہو گئی تھیں[3]

معراج النبی اور عقیدہ اہل سنّت | مخدوم صاحب نے ایک مجلس میں واقعہ معراج پہ گفتگو فرماتے ہوئے
کہا کہ آں حضرت کو معراج بیداری کے عالم میں جسم کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک واقعہ معراج کا منکر کافر ہے۔ بعض کے نزدیک وہ کافر نہیں۔ لیکن مبتدع ضرور
حق بات یہ ہے کہ مسجد الحرام سے بیت المقدس تک کے معراج کا منکر کافر ہے۔ کیونکہ یہ قرآن سے ثابت ہے۔
بیت المقدس سے آسمان تک معراج کے منکر کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ معراج کے اس حصہ کا ذکر صرف ا
حدیثوں میں آیا ہے۔ اور "احاد" کا منکر کافر نہیں ہوتا[4]

اسی مجلس میں جامع ملفوظات مولانا زین بدر عربی نے سوال کیا "کیا حضورؐ نے خدا کو دیکھا تھا؟" اس
مخدوم صاحب نے فرمایا کہ طبقۂ صوفیہ اور ان کے بڑے بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ حضورؐ نے خدا کو نہیں دیکھا
ہی کوئی شخص اس دنیا میں خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے۔

من زعم ان محمداً رأی ربہ فقد کذب[5]۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ محمد مصطفیٰؐ نے اپنے رب کو دیکھا
وہ جھوٹ بولتا ہے۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اہل سنّت کی اکثریت کا عقیدہ حضرت عائشہؓ کے قول پر ہے۔ جو لوگ
ابن عباسؓ۔ انس بن مالکؓ اور اسماءؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے خدا کو دیکھا تھا، وہ کہتے
حضورؐ کے لئے خاص تھا۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے لئے خلت۔ حضرت موسیٰؑ کے لئے ہم کلامی۔ اور حضورؐ
رویت۔ لیکن اہل سنت کے لئے اکثریت اس عقیدہ کے خلاف ہے۔ لیکن اس عقیدہ کے حامل کو کافر یا بدعتی نہ
کیونکہ یہ خطا ہے[5]

---

[1] زین بدر عربی۔ معدن المعانی مطبوعہ بہار شریف ۱۸۸۴ ص ۵۳ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۵، و ۵۳ [4] ایضاً ص ۳، [5] ...
[5] ایضاً

عقیدہ اہل سنّت | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق میں افضل ترین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے بعد انبیاء کرام کا مقام ہے۔ انبیا کرام کے بعد بنی نوع انسان میں امت محمدیہ سب سے افضل ہے اور امت محمدیہ میں سب سے اونچا درجہ ابوبکر صدیقؓ کا ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کا مقام ہے۔ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کا درجہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا رتبہ ہے۔ یہ مراتب بیان کرنے کے بعد مخدوم صاحب نے فرمایا۔ ایں است مذہب اہل سنت وجماعت[1]

مخدوم صاحب کے شجرۂ طریقت میں حضرات علی رضا۔ موسیٰ کاظم۔ جعفر صادق۔ محمد باقر۔ زین العابدین۔ حضرت حسین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے نام آتے ہیں[2] اس کے باوجود وہ تفضیل کے قائل نہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ | مخدوم صاحب ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کو "فقیہۂ امت" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ان سے آدھا دین ہمیں ملا ہے۔ وجوبِ غسل کے مسئلہ پر ان کا فتویٰ تمام صحابہؓ نے تسلیم کیا ہے۔ ان کے اس فتویٰ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ اب اگر کوئی وجوب غسل کا قائل نہ ہوگا تو وہ اسے سزا دیں گے[3]

عاشق رسولؐ کی وصیت | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کسی بزرگ نے اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی کہ اسے گنبد خضرا سے باہر آں حضورؐ اور شیخین کریمینؓ کے قدموں میں دفن کریں اور اس کی قبر پر جو کتبہ لگائیں اس پر یہ عبارت کندہ کرائیں۔

و کلبھم باسط ذراعیہ بالوصید[4]

امامت کی اجرت | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اب یہ رواج ہوگیا ہے کہ ائمہ مساجد تنخواہ لینے لگے ہیں اور وہ ہر ماہ ایک مقررہ رقم اجرت کے طور پر وصول کرتے ہیں۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ "امامت باجر معیّن مکروہ ہست"[5]

انگوٹھے چومنے کا مسئلہ | کسی شخص نے اذان میں حضور نبی کریمؐ کا نام نامی سن کر انگوٹھے چومنے کے بارے میں سوال کیا تو مخدوم صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے کسی کتاب میں اس کے جواز کے بارے میں نہیں پڑھا اور جو کتابیں ان کے پاس ہیں ان میں بھی کہیں اس کا ذکر نہیں آیا[6]

---

[1] زین بدر عربی۔ معدن المعانی مطبوعہ بہار شریف صد ۸۳،۸۲ [2] ایضاً صد ۱۹۵ [3] ایضاً صد ۸۰ [4] سورہ کہف میں اس مضمون کی جو آیت ہے وہ یوں ہے: وکلبھم باسطٌ ذراعیہ بالوصید [5] ایضاً صد ۱۰۳
[6] ایضاً صد ۱۱۶

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا ضیاء الدین سنامی محدث بھی تھے اور مفسر بھی۔ ایک روز ان کے وعظ میں مخدوم صاحب بھی شریک تھے۔ اتفاق سے کسی شخص نے ان سے انگوٹھے چومنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ کتابوں میں تو یہ مسئلہ کہیں نظر نہیں آیا۔

نماز میں صحیح تلفظ | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا قیام الدین نے ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں مرقوم ہے کہ جو شخص سمع اللہ لمن حمدہ میں ہ نہیں پڑھتا اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔[1]

طالبوں کی اقسام | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ طالبوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ طالبِ دنیا۔ وہ دنیا کا چاکر ہو کر رہ جاتا ہے۔

۲۔ طالبِ عقبیٰ۔ وہ عقبیٰ کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔

۳۔ طالبِ مولیٰ۔ دنیا اور عقبیٰ دونوں اس کے چاکر ہو جاتے ہیں

ویدانت کا اثر | ایک روز مخدوم صاحب اپنے مریدوں کے جلو میں تشریف فرما تھے کہ ان کے فرزند نے آکر یہ اطلاع دی کہ ایک شخص سر کے بل کھڑا تلاوت کر رہا ہے۔ مخدوم صاحب نے فرمایا کہ اس طریق کو "کا" کہتے ہیں اور یہ جوگیوں کا طریقہ ہے۔ شیخ تمیمی ایک بزرگ ہو گذرے ہیں وہ رات کو سر کے بل کھڑے ہو کر قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے۔[2]

اللہ کا ذکر سپر ہے | مخدوم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ذکر مریدوں کے لئے تلوار کا حکم رکھتا ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور اپنے اوپر نازل ہونے والی آفات سے بچتے ہیں۔[3]

مرید کی صفات | حضرت فرماتے ہیں کہ مرید اسے کہتے ہیں جو قولاً، فعلاً، قلباً اور قالباً اپنے پیر کی متابعت کرے۔ قولاً سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کے اصول و فروع میں اپنے پیر کی مطابعت کرے۔

فعلاً کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی بھی دینی یا دنیاوی کام اپنے پیر کے حکم کے بغیر نہ کرے۔

قلباً سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ وہ اپنے دل کو تمام مذموم صفات سے پاک کرے جیسا کہ اس کے پیر نے کیا۔

قالباً سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ اپنے حواس و جوارح کو معصیت سے پاک رکھے جیسا کہ اس کے پیر نے کیا۔

جو شخص ان چار اصولوں پر عمل کرتا ہے اسے مرید کہتے ہیں۔[4]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کئی مرید ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پیر کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتے ہیں کہ انہیں کچھ بتانے یا سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے پیر کو جو کام کرتے دیکھتے ہیں اس پر عامل ہو جاتے ہیں۔

---

[1] معدن المعانی صہ ۱۱۷ [2] ایضاً صہ ۱۱۸ [3] ایضاً صہ ۱۴۹ [4] ایضاً صہ ۱۵۶

ایسے مرید کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت مشغول رہے اگر وہ نفل ادا کرتے کرتے تھک جائے تو بیٹھ کر تلاوت شروع کردے اور اگر تلاوت سے بھی جی اکتا جائے تو ذکر شروع کردے۔ مرید کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تزکیہ و تصفیہ سے قبل کوئی عمل اختیار نہ کرے[1]

صوفیوں میں بیعت کی ابتدا | حضرت فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں حلق، قصر اور بیعت اس طرح سے نہیں ہوتی تھی جیسی اب ہوتی ہے۔ یہ طریقہ حضرت جنید بغدادی کی اختراع ہے[2]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی کو مرید کرتے وقت مروجہ طریقہ پر بیعت نہیں کرتے تھے وہ مرید کے سر پر ٹوپی اوڑھا دیتے تھے اور اسے ہی کافی سمجھتے تھے[3]

حضرت رکن عالم کا امتحان | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جب حضرت رکن عالمؒ پہلی بار دہلی تشریف لائے تو علماءَ نے ان کی قابلیت جانچنے کے لیے بزدوی سے پانچ مشکل سوال دریافت کئے۔ حضرت نے ان کا تسلی بخش جواب دیا اور رونے لگے۔ حاضرین نے رونے کا سبب پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ زمانۂ طالب علمی میں جب وہ بزدوی پڑھ رہے تھے تو استاد نے ان ہی پانچ مسائل پر تقریر کی لیکن موصوف کے پلے کچھ نہ پڑا۔ حضرت نے ادھر ادھر دیکھا تو ان کے والد بزرگوار حضرت صدر الدین عارفؒ ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ حضرت صدر الدین نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ایک جگہ لے جا کر وہ مسائل انہیں اچھی طرح سمجھا دئے۔ اس کے بعد حضرت عارف فرمانے لگے کہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح یاد کرلیں۔ ایک روز ان کی ضرورت پڑے گی۔ حضرت رکن عالم فرماتے ہیں کہ وہ مدت سے اس موقع کے منتظر تھے، تیس برس انتظار کے بعد یہ موقع ہاتھ آیا ہے[4]

عصمت انبیاء | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام اپنی بعثت سے قبل اور بعثت کے بعد دوسرے تمام لوگوں سے عارف ہوتے ہیں[5]

صحبت صالح | مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ صالح لوگوں کے ساتھ صحبت عبادت میں مشغول رہنے سے افضل ہے[6]

حفظان صحت | مخدوم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ٹوٹی ہوئی کنگھی سے بال بنانے سے غربت بڑھتی ہے[7]

آپ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ دو آدمی ایک کنگھی استعمال نہ کریں۔ اور ایک کپڑے سے ہاتھ منہ نہ پونچھیں[8]

سیر و سیاحت کے فوائد | زین بدر عربی اس پر شاہد ہیں کہ دہلی تک سے لوگ مخدوم صاحب کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے بارے میں حضرت اپنے معتقدین سے کہا کرتے تھے۔ درسفر فوائد و معانی بسیار است۔[9]

---

[1] معدن المعانی ص ۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۶۴ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۰۹ [5] ۲۲۶ [6] ص ۲۹۲ [7] ص ۲۸۷ [8] ص ۲۲۶ [9] ص ۳۲۴

اشاعت اسلام | ایک دن ایک درویش نے مخدوم صاحب سے کہا کہ ان کی برکت سے یہاں (بہار) میں اسلام کا غلبہ ہو جائے گا۔ اور مسلمان قوت پکڑ لیں گے۔ حضرت نے فرمایا

ہرچہ از زبان درویشاں رود ہمچناں شود[1]

مخدوم صاحب کا ذوق مطالعہ | ملفوظات میں تذکرۃ الاولیاء۔ ترغیب الصلوٰۃ۔ شرح تعرّف۔ لوامع قاضی حمید الدین ناگوری۔ اداب المریدین۔ وصیت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی۔ مختصر عقیدہ نسفی۔ قوت القلوب۔ عوارف المعارف، تمہیدات عین القضاۃ۔ کنز المسائل۔ فوائد الفواد۔ روضۃ العلماء احیاء العلوم۔ مکتوبات عین القضاۃ۔ روح الارواح اور تفسیر امام زاہد کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں مخدوم صاحب کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ اور بہار جیسے دور افتادہ علاقے میں موجود تھیں۔

اسی طرح ملفوظات میں جا بجا اشعار ملتے ہیں۔ جن سے مخدوم صاحب کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے معدن المعانی کی ابتدا میں مخدوم صاحب نے جس انداز سے صفات باری تعالیٰ پر گفتگو فرمائی ہے یہ انہی کا حصہ ہے

---

[1] معدن المعانی ص ۴۷۲

بقیہ از ص ۴۴ مذاہب اہل کتاب

جن کے بڑے مدلل اور مسکت جوابات مصنف نے دیئے ہیں اور حوالے سبھی عیسائی مصنفین اور کتب کے ہیں۔ چنانچہ یہ حصہ خاصا دلچسپ اور معلومات افزا ٹھہرتا ہے کہ اس میں کئی زائد اٹھائے گئے نکات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اگر انصاف اور معقولیت سے غور کیا جائے تو مزید انگشت نمائی اور نکتہ چینی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

کتاب کے آخر میں "اشاریہ" اور "کتابیات" کی شمولیت نے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب مطالعہ ادیان کے شائقین کے لئے ایک گراں قدر تحفے کی حیثیت رکھتی ہے امید واثق ہے کہ یہ تحفہ اس سمت سفر کرنے والوں کے لئے نہایت اہم اور روشن سنگ میل ثابت ہوگا بے جا ضد اور تعصب کا تو کوئی علاج نہیں۔ خلوص اور نیک نیتی سے تلاش حق مقصود ہو تو کئی دروازے کھلے بھی ملیں گے جو کشادہ دل اور پیش رفت کی راہ دکھائیں گے۔ سچائی کے امیدوار اور طلب گار کو اس کتاب کے اوراق میں اپنے دل کی دھڑکنوں کی بازگشت سنائی دے گی اور حقیقت کی منزل کا مسافر پکار اٹھے گا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لند ہمّت
وانوں کی پسند
جالا ڈینِم
ور
مدف شرٹِنگ
مبوط و دیرپا اُجالا واش اینڈ ویئر ڈینم
شمار رنگوں میں لیجئے۔
دف شرٹنگ بہت سے پکّے رنگوں میں
ستیاب ہے۔
ندہ دل جوانوں کا ذوقِ زیبائش
ج جنکے دم سے رونق اور چہل پہل ہے۔
Toray
TETORON
محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

ڈاکٹر وحید الرحمن شاہ
صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج پشاور

مخزن التفاسیر (پشتو)

مولانا محمد الیاس کوچیانی

مفسر مولانا محمد الیاس بن مولانا محمد ایوب بن مولانا محمد طیب ضلع پشاور کے موضع کوچیاں میں تقریباً ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا خاندانی تعلق قندہار (افغانستان) سے ہے۔ اور اخون زادگان کے نام سے مشہور ہیں پ کے والد بزرگوار سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں تیراہ کوہاٹ کے مشہور روحانی پیشوا مولانا احمد جی صاحب المعروف صاحب بابا جی شہید (متوفی ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء) کے مرید وخلیفہ مجاز تھے۔

مولانا محمد الیاس نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ علم نحو کی کتابیں مولانا محمد ایوب جان ہزاروی مقیم پشاور سے راہ میں پڑھیں۔ اور ما بقیہ علوم کی تکمیل مجاہد کبیر سید احمد شہید بریلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء) کے رفیق جہاد مولانا بخش شہید (متوفی ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶ء) کے عالم وفاضل صاحب زادے مولانا عبد الرب دربھنگوی (م ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۴ء) سے کی۔ دورۂ حدیث کے لیے ہندوستان چلے گئے۔ جہاں آپ نے مولانا سید محمد نذیر حسین بن سید جواد علی محدث دہلوی توفی ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) سے صحاح کی سند حاصل کی۔

مولانا محمد الیاس نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ دوران طالب علمی اور بعد فراغت کے جاری رکھا۔ آپ چاروں زبانوں عربی۔ فارسی۔ اردو اور پشتو میں روانی سے لکھ سکتے تھے۔

ہندوستان میں مولوی عین القضاۃ لکھنوی (متوفی ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۵ء) نے آپ کو اپنے مدرسہ عین القضاۃ لکھنو مدرس مقرر کیا۔ اس دوران آپ نے مطبع مجتبائی سے شائع شدہ اسلامی کتب کی تصحیح کی اور ان پر اضافے کئے۔

مولانا صاحب نے اپنی عمر کا آخری حصہ آبائی گاؤں کوچیاں میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔ ۱۳ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں تقریباً نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور گاؤں کے قریبی مقبرہ جہل گزی یا با میں دفن گئے۔

آپ سلسلہ نقشبندیہ میں والد ماجد کے شیخ صحبت جناب استاذ صاحب مرحوم کوہاٹی کے پیرو تھے۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا گل فقیر احمد صاحب پشاوری (متوفی ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء) اور مولانا محمد جان صاحب المعروف غلجی میاں صاحب سر فہرست ہیں[1]

"مخزن التفاسیر" مولانا صاحب کی تصانیف میں سے ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس کو آپ نے دوران طالب علمی لکھا ہے۔ اور ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں مطبع خادم الاسلام دہلی سے چھپوایا ہے۔ یہ مطبوعہ ۱۶۱۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں۔

مخزن التفاسیر کو صوبہ سرحد کے مطبوعہ (مکمل) تفسیری سرمایہ میں پہلا اور زمانے کے لحاظ سے پشتو تفاسیر میں تفسیر یسیر[2] کے بعد دوسرا مقام حاصل ہے۔

مخزن التفاسیر کے متعلق حافظ محمد ادریس (متوفی ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء) نے اپنے ایک مضمون "پشتو ادب میں تفاسیر کا ذخیرہ" میں جامع الفاظ میں مندرجہ ذیل تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

"تفسیر یسیر کے بعد جس بزرگوار نے قرآن مجید کی خدمت کے لئے قلم اٹھایا وہ مولانا محمد الیاس پشاوری کوچیانی تھے۔ کوچیان پشاور سے شمال کی طرف ورسک جانے والی سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس فاضل محقق نے لکھا کہ تفسیر یسیر میں ترجمہ اور تفسیر دونوں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور پڑھنے والا ٹھیک طرح

---

[1] تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی ص ۵۹۵۔ ب۔ روحانی رابطہ از عبدالحلیم اثر ص ۹۴۸۔ ج۔ زبانی یادداشتیں د۔ قلمی حالات از مولانا عبدالقیوم بن مولانا محمد الیاس کوچیانی نقشبندی نظامی ص ۹۲۔ ک۔ موج کوثر شیخ محمد اکرام ایم اے ص ۲۱ ۲۸۔ ل۔ سب رنگ ڈائجسٹ جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۹۳۔ م۔ تذکرہ صوفیائے سرحد۔ اعجاز الحق قدوسی ص ۳۰۰، ۲۹۹ ن۔ تقویم تاریخی۔ عبدالقدوس ہاشمی ص ۳۳۶۔ و۔ بیاض سید محمد امیر شاہ قادری پشاوری۔ ی۔ بیاض قاضی محمد علی عربی مدرس گورنمنٹ ہائی سکول ۲ پشاور صدر۔ ق۔ تراجم علمائے حدیث ہند از ابویحیی امام خان نوشہروی ص ۱۳۳۔

[2] زیر نظر تفسیر کے علاوہ مولانا محمد الیاس صاحب نے۔۱۔ رسالہ تصوف مسمی بہ "سیر السلوک الی ملک الملوک" کا بزبان فارسی اور پشتو ترجمہ۔۲۔ حرب البحر کا بزبان فارسی و پشتو ترجمہ۔۳۔ حاشیہ بحر العلوم۔۴۔ تصحیح و اضافہ حاشیہ مشکوٰۃ شریف۔۶۔ حاشیہ مراح اور۔۷۔ شرح مائۃ عامل وغیرہ تصانیف بھی کی ہیں جن میں اکثر طبع ہو چکی ہیں۔ [2] تفسیر یسیر پشتو ادب میں سب سے پہلی مستند اور صحیح کتاب ہے جو مولانا مراد علی ولد شیخ عبدالرحمان ساکن کامہ۔ جلال آباد افغانستان کی تصنیف ہے۔ جلد اول آپ نے ۱۲۸۲ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۲۸۴ھ میں مکمل کر دی۔ جلد دوم جلد اول کے بارہ سال بعد ۱۲۹۶ھ میں لکھی۔ ترجمہ نیم لفظی نیم با محاورہ کا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ دوران تفسیر بھی کی ہے۔ صوبہ سرحد کے مردوں اور عورتوں میں یکساں مقبول و معروف ہے۔

[3] سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر جلد ۲ ص ۶۶۱، ۶۶۲

سے یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ کون سا لفظ کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے مخزن التفاسیر کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔ اس میں لفظی ترجمہ عربی عبارت کے نیچے لکھنا اور تفسیری مسائل اوپر حاشیہ میں درج کئے۔ ترجمہ تحت اللفظ کیا۔ اور عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کم کئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عربی سے شُدھ بُدھ رکھنے والے لوگ بہ آسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ پشتو کا کون سا لفظ عربی کے کس لفظ کے معنی دے رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں لفظی ترجمہ میں بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ حضرات حروف عاملہ کے بھی ہو بہو وہی معنی لکھتے ہیں جو اصل عربی میں مراد ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ہر زبان کے صلے مخصوص ہوتے ہیں۔ اور ایک زبان کا صلہ اکثر دوسری زبان میں کام نہیں دیتا۔ ایک نوع کی زبانوں تو شاید یہ سلسلہ تھوڑا بہت چل بھی سکے لیکن جب سامی زبان کا ترجمہ آریائی زبان میں کیا جائے اور اس میں حروف کے بھی اپنے مخصوص معنی رہنے دئے جائیں۔ تو ترجمہ "گلابی" ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور مطلب غت ربود ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ حضرات لفظی ترجمے میں عربی کی تبعیت میں مضاف کو مضاف الیہ پر اور موصوف کو صفت پر مقدم رکھتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کی حلاوت بھی ختم ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کے پلے بھی کچھ نہیں پڑتا۔ لوگ ایسے ترجمے کو صرف ثواب اور تبرک سمجھ کر پڑھ تو لیتے ہیں۔ مگر فہم کی لازوال دولت سے محروم رہتے ہیں۔

حافظ صاحب آگے لکھتے ہیں کہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مخزن التفاسیر عوام میں وہ مقام حاصل نہ کر سکی جو اس کا جائز حق تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ مصنف نے بجائے مقامی ناشرین کے دہلی کے مطبع خادم الاسلام سے معاہدہ کیا اور ۱۳۱۳ھ میں یہ کتاب وہاں چھپ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی ناشرین نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اور کتاب کے اکثر نسخے دہلی ہی میں رہ گئے۔ اس کے علاوہ ایک افتاد یہ پڑ گئی۔ کہ کاتب کا رسم الخط ناقص تھا اس نے کئی جگہ حروف کا کام حرکات سے لیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حرکات ثلثہ حروف علّت کی مخفف شکلیں ہیں اس لئے جگہ جگہ تخفیف کے اس کلہاڑے کو بے دریغ چلایا جس سے کتاب کی قیمت بہت گھٹ گئی۔

حافظ صاحب اپنے تجربے کی بنا پر لکھتے ہیں کہ

دوسری زبانوں کے مقابلے میں پشتو میں ایک تکلیف یہ ہے کہ اس کا رسم الخط ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ مصنف ہمیشہ کاتب کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ اگر کاتب ماہر نہ ہو تو مصنف کی محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور کتاب کا حلیہ بالکل بگڑ جاتا ہے۔ اس عذاب کو کچھ وہی لوگ بہتر جانتے ہیں۔ جنہیں میری طرح ایک کتاب لکھوانے کے لئے پانچ پانچ کاتب بدلنے پڑے ہوں۔

لیکن مخزن التفاسیر کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر لکھتے وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء) شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء) اور شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء) کے قرآن مجید کے تراجم مولانا محمد الیاس کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان تراجم میں سے جہاں جس لفظ کو مناسب اور

موزوں سمجھا۔ وہاں تحت اللفظ پشتو کے ترجمہ میں استعمال کیا۔ اور جس لفظ کا روزمرہ کے استعمال کے مطابق متبادل لفظ پشتو میں مستعمل نظر آیا انہی کو تحت اللفظ ترجمہ میں پیش کیا۔ مثلاً

۱۔ پارہ ۲۵۔ رکوع ۲۔ آیت ۹ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب کا قرآن مجید مع ترجمہ کے ص ۶۴۳ پر یوں ہے۔

"وآنچہ اختلاف کردید درآں ہر چہ باشد پس فیصل کردن او حوالہ بخدا است"

یعنی اور جس چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ خدا کے حوالے ہے۔

اس آیت کریمہ کا ترجمہ مخزن التفاسیر کے ص ۴۴۲ پر یہ نقل کیا ہے۔

" او هغه چه اختلاف د کړو ناڅو په کښ یعنی پوشی کښې نو فیصله د هغې د خدا تعالیٰ په حوا

ترجمہ۔ اور جس چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ خدا کے حوالے ہے۔

۲۔ پارہ ۱۷۔ سورہ انبیاء۔ رکوع ۶ آیت ۹۴۔ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء) اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن (متوفی ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء) نے یوں کیا ہے۔

"اور ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لیا لوگوں نے آپس میں اپنا کام"

اسی ترجمہ کو مخزن التفاسیر نے ص ۲۹۹ پر یہ کیا ہے

" او ټکړې ټکړې کړه دوی دا کار د دین خپل په مینځ خپل کښې"

ترجمہ۔ انہوں نے دین کا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹ لیا۔

۳۔ سورہ الکوثر میں " الْأَبْتَرُ " کا ترجمہ شاہ ولی اللہ نے "دم بریدہ" شاہ رفیع الدین نے "بے نسل"، شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند نے "پیچھا کٹا" کیا ہے۔ مولانا محمد الیاس نے مخزن التفاسیر کے ص ۶۷۰ پر "میراث پات" یعنی پشتو محاورے میں لاولد، لاوارث کیا ہے۔

۴۔ قرآن مجید کی آخری سورت " والناس " کے تراجم

ا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

" بگو پناہ میگیرم بہ پروردگار مردمان بادشاہ مردمان معبود مردمان از شر وسوسہ اندازندہ چوں ذکر کردہ شد باز پس روندہ آنکہ وسوسہ مے افگند در سینہ ہائے مردمان از جنس جن باشد یا از جنس مردمان"

ب۔ شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ

"تو کہہ میں پناہ میں آیا۔ لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے پوجے کی بدی سے اس کی جو سنکارے اور چھپ جاوے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں" د۔ شیخ الہند مولا
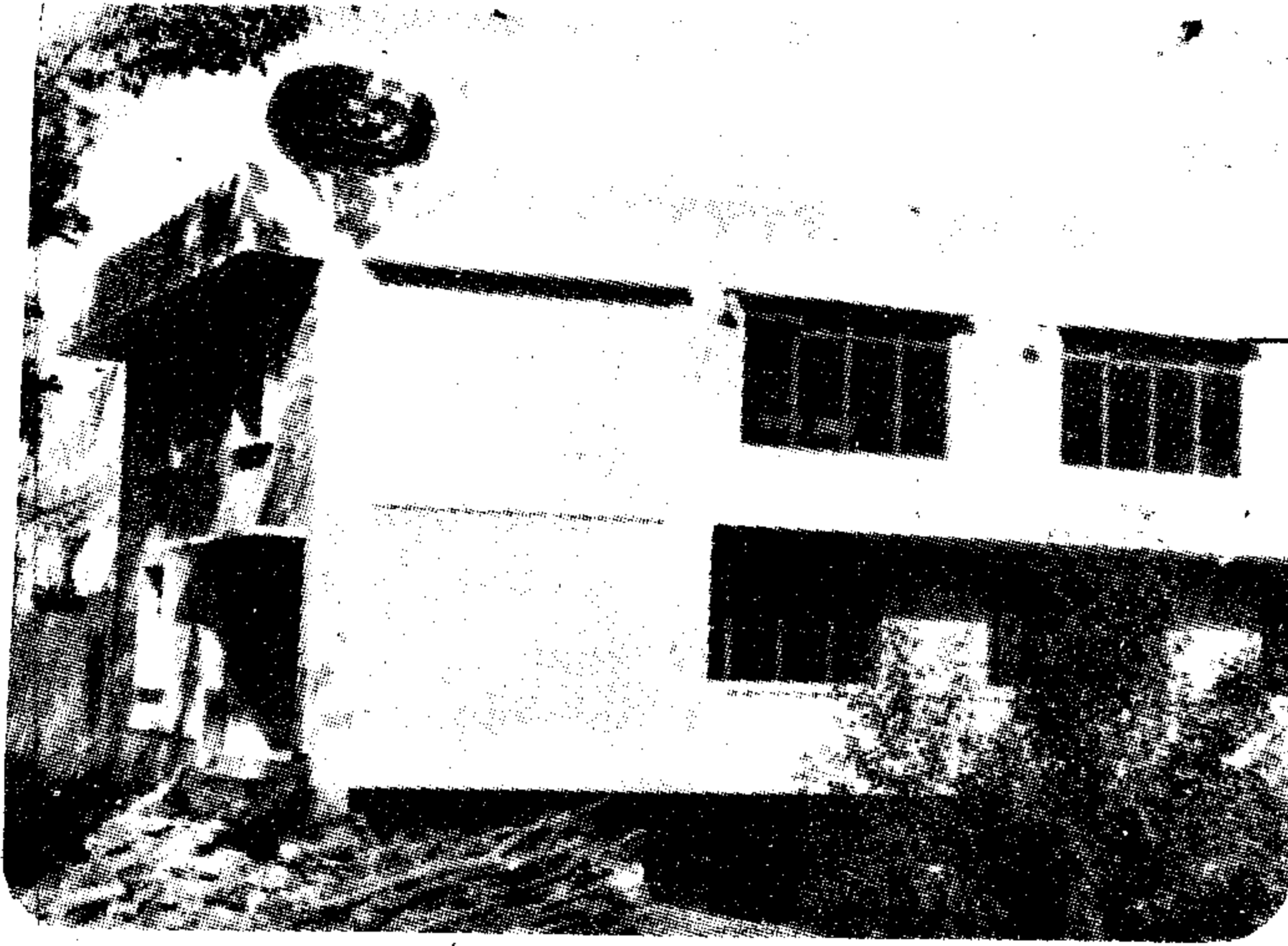
دارالعلوم حقانیہ کے شب و روز

شفیق فاروقی

مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس کتب خانہ کے وسیع ہال میں مجلس شوریٰ دارالعلوم کا سالانہ اجلاس زیر صدارت جناب حاجی طاؤس خان صاحب جہانگیرہ منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن پاک جناب مولانا عبدالخالق صاحب خطیب کوہ نور ملز راولپنڈی نے فرمائی۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے استقبالیہ کلمات میں اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے حفاظت دین اور مدارس عربیہ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فضلا حقانیہ کی وسیع و ہمہ گیر خدمات اور دارالعلوم کے ایک نئے شعبہ "دائرۃ المعارف القرآنیہ" (دارالحفظ والتجوید) کے قیام پر بھی خداتعالیٰ کا شکر ادا فرمایا۔ اس کے بعد مولانا سمیع الحق صاحب نے دارالعلوم کی سالانہ کارگذاری مصارف اور مدات آمد و خرچ پر مفصل رپورٹ پیش کی۔

آپ نے بتایا کہ سال گذشتہ دارالعلوم کو مختلف مدات سے بارہ لاکھ سولہ ہزار ترانوے روپے اکسٹھ پیسے (۱۲،۱۶،۰۹۳ - ۶۱ روپے) کی آمدنی ہوئی۔ جب کہ مختلف شعبوں پر بارہ لاکھ اکتیس ہزار ایک سو اکتالیس روپے اٹھاسی پیسے (۱۲،۳۱،۱۴۱ - ۸۸ روپے) خرچ ہوئے۔ سال رواں کے لئے آپ نے گیارہ لاکھ پچاسی ہزار آٹھ سو اٹھانوے روپے بیس پیسے (۱۱،۸۵،۸۹۸ - ۲۰ روپے) کا میزانیہ پیش کیا جس کا تفصیلی نقشہ شامل اشاعت ہے۔

ارکان شوریٰ نے بجٹ پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اور منظوری عنایت فرمائی۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے گذشتہ سال وفات پانے والی عالم اسلام کی اہم دینی و علمی شخصیت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ اور دیگر وابستگان دارالعلوم کے لئے دعائے مغفرت کی۔

یکم ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ پرنسپل کلیۃ القرآن الکریم والدراسات الاسلامیہ واستاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جناب الشیخ بلال دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے۔ بعد نماز عصر آپ نے طلبار سے خطاب بھی فرمایا۔

نقشہ میزانیہ دارالعلوم حقانیہ

برائے سال رواں ۱۴۰۲ھ و اخراجات ۱۴۰۱ھ (میزانیہ ۱۱ لاکھ پچاسی ہزار آٹھ سو اٹھانوے روپے بیس پیسے)

مدات	اخراجات ۱۴۰۱ھ (پیسے)	اخراجات ۱۴۰۱ھ (روپے)	میزانیہ ۱۴۰۲ھ (پیسے)	میزانیہ ۱۴۰۲ھ (روپے)
مطبخ	۱۱	۳,۲۶,۸۹۸	--	۲,۹۰,۰۰۰
ڈاک	۲۵	۳,۹۶۶	--	۵,۰۰۰
نقد امداد	--	۲,۸۹۶	--	۲۳۰۰
کرایہ مکانات	--	۳۸۰	--	۶۰۰
روشنی و فٹنگ	۳۵	۲۷,۳۴۶	--	۳۵,۰۰۰
صابن	--	۵,۵۶۴	--	۵,۵۰۰
اخبارات	۷۵	۹۹۹	--	۱,۳۵۰
اشاعت	--	۳,۴۸۶	--	۱,۵۰۰
امتحانات	۵۰	۱,۰۶۷	--	۱,۳۰۰
باغیچہ	--	۱۰۹	--	۶۰۰
کتب خرید و مرمت	--	۳,۲۴۲	--	۸,۵۰۰
سفارت	۵۱	۴۱,۸۴۷	--	۴۱,۰۰۰
اسٹیشنری	۵۰	۲,۰۵۳	--	۲,۰۰۰
تنخواہ والاؤنس مدرسین و عملہ	۳۹	۲,۳۰۱,۳۷۰	--	۳،۵۵۱۰۰۰
تعلیم القرآن (مڈل سکول)	۰۴	۴۸,۱۳۸	--	۶۲,۰۰۰
واٹر پمپ خرید و مرمت	۷۰	۴,۱۵۷	--	۱,۰۰۰
سامان خرید و مرمت	۶۰	۵,۸۴۰	--	۱۰,۰۰۰
آب رسانی	۹۰	۹,۴۹۸	--	۱۳,۶۰۰
آمد و رفت	۲۰	۸,۱۴۶	--	۹,۰۰۰
تعمیر دارالاقامہ	۱۹	۷۱,۹۶۳		۱,۵۰,۰۰۰
تعمیر کچن	--	۸,۹۷۲		۸۵۴
تعمیر دارالحفظ	۸۳	۳,۸۳,۶۳۱	--	—
قبرستان	۷۰	۲,۰۲۴	--	۲۵۸
مرمت تعمیرات	--	۱۰,۷۹۰	--	۲۵,۰۰۰
تکمیل عمارت دورا المدرسین	--	۲,۷۶۹		—
ٹیلیفون	۹۵	۵,۹۲۱	--	۴,۵۰۰
بنک کمیشن	۲۰	۷۱	--	۴۰
آڈٹ فیس	--	۵۰۰	--	۵۰۰
درس ریکارڈ	۱۵	۲۰۷	--	۴۰۰
لاؤڈ سپیکر خرید و مرمت	--	۱,۴۵۵	--	۳۵۰
تبلیغ (مطبوعات موتمر المصنفین)	--	۳,۳۱۰	--	۴,۰۰۰
تجہیز و تکفین	۵۰	۱,۸۴۳	--	—
سوئی گیس	۵۷	۷,۵۲۱	--	۲,۳۰۰
الیکٹرک واٹر کولر	--	۱۸،۱۰۱۰	--	—
ماہنامہ الحق	۹۸	۹۴,۸۲۴	--	۱,۱۰,۰۰۰
وفاق المدارس	--	۱,۰۰۰	۲۰	۱,۲۰,۹۰۹
میٹر بجلی	--	—	--	۵۹۰
زمین خرید برائے تعمیرات	--	—	--	۱,۲۵,۰۲۰
میزان	۸۸	۱۲,۳۱,۱۴۱	۲۰	۱۱,۸۵,۸۹۸

جونیئر کیڈٹ کورس

میں شامل ہو کر اپنے مستقبل کو درخشاں بنایئے

چار سال میں بی۔اے/بی۔ایس۔سی کی ڈگری اور ریگولر کمیشن حاصل کیجئے

اس کورس کے ذریعے ہونہار میٹرک پاس نوجوانوں کو پاکستان کی بری فوج میں آفیسر بننے کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے۔

شرائط اہلیت

قومیت: (۱) پاکستان کے مرد شہری
(۲) آزاد کشمیر کے شہری اور سٹیٹ سبجکٹ کلاس I

ازدواجی حیثیت: غیر شادی شدہ

عمر: (۳۱ مارچ ۱۹۸۳ کو) (۱) سویلین : ۱۵ تا ۱۸ سال
(۲) فوجی : ۱۷ تا ۲۰ سال

تعلیم

(۱) سویلین : میٹرک (فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن) یا مساوی
(۲) فوجی : آرمی سپیشل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن یا آرمڈ فورسز میٹرکولیشن امتحان (فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن)

نا اہلیت

مندرجہ ذیل اس سکیم کے لئے درخواستیں دینے کے اہل نہیں،
(۱) ایسے امیدوار جو آئی ایس ایس بی سے دو مرتبہ سکرین آؤٹ یا مسترد ہو چکے ہوں۔
(۲) ایسے امیدوار جنہیں آرمڈ فورسز اپیل میڈیکل بورڈ نے مسترد کر دیا ہو۔
(۳) ایسے امیدوار جنہیں مستقل طور پر میڈیکل بورڈ/سی ایم بی نے مسترد کر دیا ہو، ماسوائے ان کے جنہیں بعد میں اپیل میڈیکل بورڈ نے موزوں قرار دے دیا ہو۔
(۴) ایسے کیڈٹ جنہیں آرمی/نیوی/ایئر فورس کے تربیتی اداروں/اکیڈمی سے نااہلیت یا ڈسپلن کی بنا پر علیحدہ کر دیا گیا ہو/نکالا گیا ہو/یا جو مستعفی ہو چکے ہوں۔
(۵) ایسے امیدوار جو فوج یا سرکاری ملازمت سے برخاست/ڈسچارج یا علیحدہ کر دیئے گئے ہوں۔
(۶) ایسے امیدوار جو انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر چکے ہوں یا سیکنڈ ایئر ایف۔اے/ایف۔ایس۔سی میں پڑھ رہے ہوں

ابتدائی انتخاب

(۱) موزوں امیدواروں کو کسی بھی روز ماسوائے تعطیلات کے ۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے درمیان صبح آٹھ بجے کسی آرمی سلیکشن اینڈ ریکروٹمنٹ سنٹر واقع راولپنڈی، لاہور، ملتان اور حیدرآباد میں ذاتی طور پر حاضر ہونا چاہیئے
(۲) شمالی علاقوں کے امیدواروں کے لئے جونیئر کیڈٹ اور پی۔ایم۔اے۔ کورس کا ابتدائی انتخاب گلگت اور سکردو میں مندرجہ ذیل پروگرام کے مطابق

(۱) پبلک سکول گلگت	۶ نومبر تا ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء
(۲) گورنمنٹ کالج سکردو	۱۳ نومبر تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۲ء

مزید انتخاب

(۱) جن امیدواروں کو آرمی سلیکشن اینڈ ریکروٹمنٹ سنٹر منتخب کریں گے ایک میڈیکل بورڈ معائنہ کرے گا اور وہ جو پاس ہو جائیں گے ان کا آئی ایس ایس بی میں ٹیسٹ/انٹرویو ہوگا۔
(۲) حتمی انتخاب جی ایچ کیو کرے گا۔

نوٹ

مندرجہ ذیل دستاویزات لازماً ساتھ لایئے
(۱) پاسپورٹ سائز فوٹو کی چار کاپیاں جو کسی افسر (گزیٹڈ کلاس I) سے تصدیق
(۲) میٹرک کا اصل یا پروویژنل سرٹیفکیٹ
(۳) کیریکٹر سرٹیفکیٹ منجانب ہیڈ ماسٹر/پرنسپل/کلاس I گزیٹڈ آفیسر
(۴) سٹیزن شپ سرٹیفکیٹ اگر آپ ۱۳ اپریل ۱۹۵۱ء کے بعد پاکستان منتقل ہوئے ہوں۔

فوجی امیدوار محکمے کے ذریعے آرمی سلیکشن اینڈ ریکروٹمنٹ سنٹر سے رجوع